Title - NAYE ASHAAR.

Creator - Murattiba Sultan Shahida Taqui.

Publisher - Educational Book Dipo (Allahabad).

Date - N.A.

Pages - 112.

Subjects - Urdu Shayari - Intikhab - Mauzoo-
- waar; Urdu Shayari - Intikhab;
Bait Baazi.

نئے اشعار

مرتبہ

سلطانہ شاہدہ تقوی - ایم اے، ڈیپ - ایڈ

پبلشر

ایجوکیشنل بک ڈپو - الہ آباد

قیمت عہ

گزارش

پیشِ نظر تالیف دورِ حاضر کے بعض مقبول و مشہور اُردو شاعروں کے کلام کا انتخاب ہے۔ یہ انتخاب ایک خاص نقطۂ نظر سے مرتّب کیا گیا ہے اس لئے قارئین اور مرتّب کے ذوق اور پسند میں اختلاف متوقع بلکہ لازمی ہے اشعار کی ترتیب نہ تو مصنّف کے اعتبار سے کی گئی ہے اور نہ اصنافِ سخن کے لحاظ سے جیسا کہ عام تالیفوں میں دستور ہے بلکہ کلام کی ترتیب موضوع کے لحاظ سے کی گئی ہے اور میں نے آٹھ عنوانات قائم کئے ہیں۔

جذباتِ فطرت مناظرِ قدرت حکمت و موعظت وطن و ملت
پیغامات طنز و ظرافت احساسات اور نکات

اس انتخاب میں سب سے زیادہ حصّہ نظموں کا ہے جو اوّل چھ عنوانوں کے ماتحت درج ہیں۔ ہماری زبان میں نظموں کے علاوہ غزل اور رباعی بھی شامل ہیں اور دورِ حاضر میں اگرچہ ترقی پسند شعراء اور نقاد زیادہ تر نظموں کی طرف مائل ہیں پھر بھی گوناگوں احساسات کی حیرت انگیز ترجمانی کے باعث غزل کی دل پسندی اور معنی خیزی و نکتہ آفرینی کے سبب رباعی کی مقبولیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن میرے لئے یہ مشکل تھی کہ رباعی تو خیر غزل کو کسی ایک عنوان کے ماتحت درج نہیں کیا جاسکتا تھا اس لئے میں نے ان کے

لئے الگ الگ عنوانات قائم کئے ہیں۔ غزلوں کو "احساسات" اور رباعیوں کو "نکات" کے ماتحت درج کیا ہے اور حتی الامکان یہ کوشش کی ہے کہ غزلیں زیادہ تر ایسی ہوں جن میں بڑی حد تک وحدتِ خیال یا مرکزِ احساس ہو۔ بیانی نظموں میں وہ نظمیں بھی شامل کر دی گئی ہیں جن میں مستقبل کے بارے میں کسی قسم کی "پیشین گوئی" کی گئی ہو۔ طنز و ظرافت کے ماتحت میں نے صرف ویسے ہی اشعار درج کئے ہیں جن میں پاکیزہ مزاح، لطیف طنز، سادہ مضمون اور سہل اشارے ہوں۔

طریقِ کار کی اس مختصر سی وضاحت کے بعد انتخاب کی غرض و غایت کو بھی بیان کر دینا ضروری سمجھتی ہوں، اردو اشعار کا یہ مجموعہ اُن نوجوانوں اُردو خوانوں کے مطالعہ کے لئے ہے جو ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے خواہش مند ہوں، اس طرح میٹرکولیشن کے طلبا اس مجموعے سے خاص طور پر استفادہ کر سکتے ہیں، یہ مجموعہ دورِ حاضر کے اردو شعرا کے بعض ذہنی رجحانات اور اردو شاعری کی بعض ادبی خصوصیتوں سے واقفیت حاصل کرنے کا ذریعہ ثابت ہوگا اور ان کے ادبی ذوق اور تنقیدی صلاحیتوں کو اُبھارنے میں بھی معاون ہوگا۔ چنانچہ مختلف عنوانات قائم کرنے کا مقصد بھی بڑی حد تک یہی ہے۔ فقط

باقر گنج، پٹنہ

سلطانہ شاہدہ نقوی

فہرست مضامین

(ب)

صفحہ	نام شاعر	عنوان
۱۸	اختر شیرانی	۶۔ حسن معصوم ....
۲۰	احسان بن دانش	۷۔ اثرات رباب ......
۲۱	مجاز ردولوی	۸۔ رات اور ریل ......

۳۔ حکمت و موعظت

۲۵	اکبر الہ آبادی	۱۔ چشم باطن ....
۲۶	شاد عظیم آبادی	۲۔ اگلے پچھلے لوگ ....
۲۸	افسر میرٹھی	۳۔ فلسفۂ کامیابی .....
۲۹	جوش ملیح آبادی	۴۔ بجھی ہوئی شمع .....
۳۰	"	۵۔ آدم کی پیدائش ....
۳۲	"	۶۔ سراغِ رہرو ....
۳۲	حفیظ جالندھری	۷۔ شہر لوپی آئی کی آخری شب

۴۔ وطن و ملت

۳۴	اکبر الہ آبادی	۱۔ دربار ۱۹۱۱ء
۳۶	اقبال	۲۔ شعاعِ امید
۳۷	روش صدیقی	۳۔ اے کشورِ ہندوستاں...
۴۰	"	۴۔ سلطان شہید

عنوان | نام شاعر | صفحہ

۷۔ احساسات

۸۔ نکات



ڈاکٹر سر محمد اقبال

جذبات فطرت

اقبال

۱۔ کنجِ عزلت

دنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یا رب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

شورش سے ہوں گریزاں دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو

مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری
داماں کوہ میں اِک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہے میں
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو

آغوش میں زمیں کے سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو

گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما ہو

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو

ہو دل فریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا ہو

مہندی لگائے سورج جب شام کی دُلہن کو
سُرخی لئے سُنہری ہر پھول کی قبا ہو

راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم
اُمید اُن کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو

پچھلے پہر کی کوئل وہ صبح کی مؤذن
میں اس کا ہمنوا ہوں وہ میری ہمنوا ہو

کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں
روزن ہی جھونپڑی کا مجھ کو سحر نما ہو

پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو، نالہ مرا دعا ہو

دل کھول کر بہاؤں اپنے وطن پہ آنسو
سرسبز جن کی نم سے بوٹا امید کا ہو

اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے میں میری صدا درا ہو

ہر درد مند دل کو رونا مرا رلا دے
بے ہوش جو پڑے ہوں شاید انھیں جگا دے

اکبر الہ آبادی

۲۔ انقلاب زمانہ

فنا اسی رنگ پر ہے قائم فلک وہی چال چل رہا ہے
شکستہ و منتشر ہے وہ کل جو آج سانچے میں ڈھل رہا ہے

یہ دیکھتے ہو جو کاسۂ سر غرور و غفلت سے کل تھا مملو
یہی بدن ناز سے پلا تھا جو آج مٹی میں گل رہا ہے

سمجھ ہو جس کی بلیغ سمجھے، نظر ہو جس کی وسیع دیکھے
کبھی یہاں خاک بھی اڑے گی جہاں یہ قلزم ابل رہا ہے

کہاں کے مشرق، کہاں کے مغرب تمام دکھ سکھ میں یہ مساوی
یہاں بھی اک بامراد خوش ہے وہاں بھی اک غم سے جل رہا ہے

ہوس پرستوں کو کیوں یہ کد ہے، ان انقلابوں کی کیا سند ہے
اگر زمانہ بدل رہا ہے بدلنے ہی کو ہے بدل رہا ہے

جنھوں نے طاعت میں جان دی ہے اُنھیں کے حصّے میں زندگی ہے
مقدموں کی ہوں لاکھ شکلیں یہی نتیجہ نکل رہا ہے
خدا سے تم دل ملاؤ اپنا، زبان کو پھر ملاؤ دل سے
تو دیکھ لوگے کہ پُر اثر ہے زباں سے جو نکل رہا ہے

منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی

۳۔ یادِ طفلی

کدھر گیا آہ! میرا بچپن نجات تھی جب غمِ جہاں سے
نہ دل تھا حسرت کشِ تمنا، نہ تھی زباں آشنا فغاں سے
کہاں گئی وہ بہارِ طفلی، کدھر گئے وہ نشاط کے دن
گلاب سا آہ! میرا چہرہ نہ زرد تھا جب غمِ خزاں سے
کبھی تھا کوئل کا ہم نوا میں کبھی تھا میں ہم سرودِ قمری
چمن میں کرتا تھا چھیڑ بھیروں میں جا کے مرغانِ نغمہ خواں سے
بہائیں کاغذ کی میں نے ناویں، بہت لب جو بنا بنا کے
برس گئی کوئی ٹھنڈی ٹھنڈی جھڑی جو ساون کی آسماں سے
کبھی تمنا کہ چاند کو میں گھر اپنے لاؤں بنا کے مہماں
کبھی یہ حسرت کہ توڑ لاؤں میں جا کے تاروں کو آسماں سے

کبھی جو آئینہ میں یکایک نظر پڑی مجھ کو اپنی صورت
رہا پہروں میں محو حیرت کہ پیاری شکل آئی یہ کہاں سے
لبوں پہ بچپن کی کیا نہ آئے گی اب وہ معصوم مسکراہٹ
ادھورے الفاظ اے جوانی! وہ کیا نہ نکلیں گے اب زباں سے
نسیم دینے کو مجھ کو لوری نہ شام فرقت میں آئے گی کیا
جگر کے ٹکڑے اُڑیں گے کب تک ہوا میں آہِ شرر نشاں سے
نہ تھی گراں باری مشاغل، نہ تھی پابندئ علائق
اسیر زنجیرِ غم نہ تھا میں، نجات تھی شورشِ جہاں سے
مرا ہنڈولا تھا عرشِ اعظم، مرے کھلونے تھے چاند سورج
اُتار لاتا تھا جا کے تارے زمیں پہ راتوں کو آسماں سے
مرا گھروندا تھا گھر کا آنگن، اسی میں مہماں تھا میرا بچپن
تجھے بلایا تھا کس نے ظالم؟ شباب! تو آ گیا کہاں سے
رہے جو تو اے شباب! مہماں، یہی غم و رنج و یاس و حرماں
نہیں ہے یہ بھی مجھے توقع طلسم نیرنگ آسماں سے
ابھی ہے تیرا انتشار باقی، ابھی بڑھاپا ہے آنے والا
فلک کو لینا ابھی ہیں بدلے بہت سے اک جزو ناتواں سے
ہزار جھگڑے ہیں زندگی کے، ہزار دنیا کے ہیں بکھیڑے
سر و ر صدمے اُٹھیں تو کیوں کر اُٹھیں یہ اک مشت استخواں سے



سرور جہان آبادی

۵

وحیدالدین سلیم

۴۔ زندگی

ذرّے ذرّے میں رواں روحِ رواں پاتا ہوں میں
زندگی کو ایک بحرِ بےکراں پاتا ہوں میں

غنچہ غنچہ نطق پر آمادہ آتا ہے نظر
پتّے پتّے کی زباں کو نغمہ خواں پاتا ہوں میں

زندہ ہستی کی خبر دیتی ہے رفتارِ نفس
بوئے گُل کو زندگی کا ترجماں پاتا ہوں میں

برق کی جنبش ہو، یا بادِ صبا کا ہو خرام
زندگی کا ہر تموّج میں نشاں پاتا ہوں میں

چپّہ چپّہ اس مکاں کا ہے مکینوں سے بھرا
زندگی کو شش جہت میں حکمراں پاتا ہوں میں

اس سے آگے بھی ہیں روحیں اُڑتی پھرتی بےشمار
طائرِ سدرہ کا جس جا آشیاں پاتا ہوں میں

ہو چکی ہے حکمراں جس نخل پر بادِ خزاں
اس کی رگ رگ میں بہارِ بےخزاں پاتا ہوں میں

چارسو راہ سفر پہ دوڑتی ہے جب نظر
زندگی کو کارواں در کارواں پاتا ہوں میں
جانے والوں کی تباہی کے نشانوں میں نہاں
آنے والی ہستیوں کی بستیاں پاتا ہوں میں
الغرض سمجھے ہو جن کو موت کی بربادیاں
زندگی کے انقلاب ان میں نہاں پاتا ہوں میں

مسلم عظیم آبادی

۵۔ آزادی

یہ آزادی کی کنیا کیسی سندر لاجونتی ہے
پری بن جاتی ہے، جب نور کا جوڑا پہنتی ہے
یہ دکھ بپتا کی پتری پھر دلھن شکتی کی بنتی ہے
غلامی سے جنم پاتی، غلامی خود کبھی جنتی ہے
غلام آزاد ہو کر چھینتے ہیں سب کی آزادی
ہے الصاف اپنے گوں کی بات اور مطلب کی آزادی
بیاں کیا اس کا ناز و عشوہ ہو، قصہ ہے طول اس کا
نہیں موقوف حسنِ خلق پہ حسنِ قبول اس کا

ہمیشہ ابرِ رحمت ہی نہیں ہوتا نزول اس کا
ہے امن و عیش پھل اُس کا تو قتل و خوں ہے پھول اس کا
کبھی موہن دھرم اس کا، کبھی محبوب دلیس اس کا
نیا ہر دور روپ اس کا، جدا ہر جگ میں بھیس اس کا
ہے جنگ حرّیت اک جرم اگر ناکام ہو جائے
نتیجہ دار و زنداں ہو، بغاوت نام ہو جائے
کہیں گر انقلاب اس سعی کا انجام ہو جائے
تو اک قزّاق بھی محبوب خاص و عام ہو جائے
پھر ایوانِ حکومت میں کٹیرے ڈنڈ پیلیں گے
حریفِ بے گنہ کے خون سے ہولی یہ کھیلیں گے
لُغت میں دہر کے ہے ظلم کوئی شے نہ مظلومی
وہ کمزوری ہے، کہتے ہیں جسے دنیا میں محکومی
رہا ہے اور رہے گا حصّہ کمزوری کا محرومی
ہو جس کے ہاتھ مگدر بھیم کا، ملک اس کی ہے بھومی
خوشامد سے، اہنسا سے، نہ زورِ اکثریت سے
ہے آزادی فقط طاقت سے، طاقت جوشِ خدمت سے
جو ہو نسل و وطن کے غلبہ تک محدود آزادی
تو قزّاقی اُسے سمجھو، نہیں مقصود آزادی

غلامی سے کہیں بدتر ہے یہ مردود آزادی
زبوں، بے سود، بے بہبود، نامسعود آزادی
نہ یہ ترکِ فرائض ہے، نہ یہ قطعِ علائق ہے
یہ حق کی بندگی ہے، مستیِ عشقِ خلائق ہے

جمیل مظہری

۲۔ شاعر کی تمنّائیں

اگر اس گلشنِ ہستی میں ہونا ہی مقدّر تھا — تو میں غنچوں کی مُٹھی میں دلِ بُلبُل ہوا ہوتا
ہوا ہوتا کسی دستارِ کج پر پھول طُرّے کا — اور اس دستارِ کج کی تمکنت پر ہنس رہا ہوتا
کسی مغرور کی گردن پہ ہوتا بوجھ احساں کا — کسی ظالم کے دل میں درد بن کر لا دوا ہوتا
کسی بھٹکے ہوئے راہی کو دیتا دعوتِ منزل — بیاباں کی اندھیری شب میں جوگی کا دیا ہوتا
کسی کے کلبۂ احزاں میں شمعِ مضمحل بن کر — کسی بیمارِ مفلس کے سرہانے رو رہا ہوتا
شرر بن کر کسی نادار گھر کے سرد چولھے میں — بصد اُمیدِ فردا زیرِ خاکستر دبا ہوتا
یتیمِ بے نوا کی رہ گذر پر اشرفی بن کر — لئیمِ فاقہ کش کی جیبِ مُمسک سے گرا ہوتا
شکستہ جھونپڑے میں بانسری دہقاں کی بن کر — سکوتِ نیم شب میں رازِ ہستی کہہ رہا ہوتا

غرض اس حسرت و اندوہ و یاس و غم کی بستی میں
کہیں درد آفریں ہوتا کہیں درد آشنا ہوتا



اکبر الہ آبادی

اثر صہبائی

۷۔ عالم افسردگی

بھیگی بھیگی ہیں چاندنی راتیں! اب کہاں وہ شباب کی باتیں!
بادۂ حسن سے سحر محروم میگساری سے ہے نظر محروم
اب وہ رنگینیاں چمن میں نہیں نزہتیں لالہ و سمن میں نہیں
شام نا آشنائے مدہوشی آہ! وہ دورِ خود فراموشی
کیف دل میں، نظر میں نور نہیں پی رہا ہوں، مگر سرور نہیں
روح میں لرزشِ حیات نہیں اب تو مے میں بھی کوئی بات نہیں

لطف باقی رہا نہ جینے میں
دل ہی بے حس پڑا ہے سینے میں

اب نہ وہ دن ہیں اور نہ وہ راتیں سب جوانی کی تھیں کراماتیں
اب وہ بے تابیٔ شباب کہاں آتشِ شوق بے حساب کہاں
حسن ہی حسن جلوہ فرما تھا عشق ہی عشق نغمہ پیرا تھا
میری ہر سانس اک فسانۂ حسن بزمِ ہستی نگار خانۂ حسن
جلوۂ حسن غیر فانی سا نغمۂ عشق جاودانی سا
شادمانی ہی شادمانی تھی کیا حقیقت تھی کیا کہانی تھی!

دل کہ تھا، حشر گاہِ جوش و خروش   شعلۂ صد ہزار در آغوش
آخر کار چاک چاک ہوا   بُجھ گیا، بُجھ کے خاک خاک ہوا
بے قراری نہ آہ و زاری ہے   ایک افسردگی سی طاری ہے
کھویا کھویا سا پھر رہا ہوں میں
گویا صحرا میں لُٹ گیا ہوں میں

۲۔ مناظرِ قدرت

اکبر الٰہ آبادی

۱۔ روانیِ دریا

وہ سودیؔ سخن گوئے شیریں مقال   جو انگریزی شاعر تھا اک باکمال
لکھی اُس نے ہے نظم اِک لاجواب   دکھائی ہے شکلِ روانیِ آب
جو بہتا ہے پانی میانِ لڈور   اُسی کا دکھایا ہے شاعر نے زور
مناسب جو انگلش مصادر ملے   مقفیٰ کیے اُن کے سب سلسلے
یہ اصرار کرتے ہیں بھائی حسن   کہ میں بھی ہوں اس بحر میں غوطہ زن
دکھاؤں روانیِ دریائے فکر   کہ گوہر شناسوں میں ہو جس کا ذکر
عجب ہے نہیں اُن کی اس پر نظر   کہاں میں کہاں سودیٔ نامور

سوا اس کے ہیں اور بھی مشکلیں — نہیں سہل اس راہ کی منزلیں
مرے پاس سرمایہ کافی نہیں — وہ مصدر نہیں وہ قوافی نہیں
زباں میں نہ وسعت نہ ویسا مذاق — ادھر تو ہے کچھ اور ہی طمطراق
اگر ترجمہ ہو تو مطلب ہو خبط — معانی میں پیدا نہ ہو ربط و ضبط

موانع یہ ہیں جس سے ڈرتا ہوں میں
مگر خیر کچھ فکر کرتا ہوں میں

جو تھیں دقتیں کہہ چکا برملا — غرض دیکھیے اب یہ پانی چلا
اُچھلتا ہوا اور اُبلتا ہوا — اکڑتا ہوا اور مچلتا ہوا
روانی میں اک شور کرتا ہوا — رُکاوٹ میں اک زور کرتا ہوا
پہاڑوں پہ سر کو پٹکتا ہوا — چٹانوں پہ دامن جھٹکتا ہوا
وہ پہلوئے ساحل دباتا ہوا — یہ سبزہ پہ چادر بچھاتا ہوا
کھٹکتا ہوا غُل مچاتا ہوا — وہ جل تھل کا عالم رچاتا ہوا
وہ گاتا ہوا اور بجاتا ہوا — یہ لہروں کو پیہم نچاتا ہوا
اُدھر جھومتا اور مٹکتا ہوا — اِدھر گھومتا اور اٹکتا ہوا
بپھرتا ہوا جوش کھاتا ہوا — بگڑ کر وہ کف مُنہ پہ لاتا ہوا
وہ اونچے سُروں میں تموج کا راگ — وہ خود جوش میں آکے لاتا یہ جھاگ
سُدھرتا ہوا اور سنورتا ہوا — تھرکتا ہوا رقص کرتا ہوا
لپٹتا ہوا اور چمٹتا ہوا — یہ گھٹتا ہوا وہ سمٹتا ہوا

یہ گھٹتا ہوا اور وہ بڑھتا ہوا — اترتا ہوا اور چڑھتا ہوا
یہ ہٹتا ہوا اور بچتا ہوا — دباتا ہوا اور لچکتا ہوا
وہ روئے زمیں کو چھپاتا ہوا — وہ خاکی کو سیمیں بناتا ہوا
گل و خار یکساں سمجھتا ہوا — ہر اک سے برابر الجھتا ہوا
بہاتا ہوا اور بہتا ہوا — ہوا کے طمانچوں کو سہتا ہوا
بلندی سے گرتا گراتا ہوا — نشیبوں میں نچرتا بھراتا ہوا
اچکتا ہوا اور اڑتا ہوا — اٹکتا ہوا اور مڑتا ہوا
وہ کھیتوں میں راہیں کترتا ہوا — زمینوں کو شاداب کرتا ہوا
یہ تالوں کی گودوں کو بھرتا ہوا — وہ دھرتی پہ احسان دھرتا ہوا
یہ پھولوں کے گجرے بہاتا ہوا — وہ چکر میں بجرے پھنساتا ہوا
لپکتا ہوا دندناتا ہوا — امنڈتا ہوا سنسناتا ہوا
چمکتا ہوا اور جھلکتا ہوا — سنبھلتا ہوا اور چھلکتا ہوا
ہواؤں سے موجیں لڑاتا ہوا — حبابوں کی فوجیں بڑھاتا ہوا
تڑپتا ہوا جگمگاتا ہوا — شعاعوں کا جوبن دکھاتا ہوا
یونہی الغرض ہے یہ پانی رواں — بس اب دیکھ لیں شاعر نکتہ داں

وہ سودی کا سیلاب آب لڈور
یہ بحر خیالات اکبر کا زور

۱۳

اقبال

۲۔ ابر

اُٹھی پھر آج وہ پورب سے کالی کالی گھٹا
سیاہ پوش ہوا پھر پہاڑ سرن کا

نہاں ہوا جو رُخِ مہر زیرِ دامنِ ابر
ہوائے سرد بھی آئی سوارِ توسنِ ابر

گرج کا شور نہیں ہے خموش ہے یہ گھٹا
عجیب میکدۂ بے خروش ہے یہ گھٹا

چمن میں حکمِ نشاطِ مدام لائی ہے
قبائے گُل میں گُہر ٹانکنے کو آئی ہے

جو پھول مہر کی گرمی سے سو چلے تھے اُٹھے
زمیں کی گود میں جو پڑ کے سو رہے تھے اٹھے

ہوا کے زور سے اُبھرا بڑھا اُڑا بادل
اُٹھی وہ اور گھٹا لو برس پڑا بادل

عجیب خیمہ ہے کہسار کے نہالوں کا
یہیں قیام ہو وادی میں پھرنے والوں کا

تلوک چند محروم

۳۔ بندرابن کی صبح

آثار عیاں ہوئے صبح کے
سامان ہونے لگے سفر کے

ہل چل میں ہے کاروانِ انجم
مغرب کو چلا نشانِ انجم

وہ شب کا سیاہ شامیانہ
اب لے کے قمر ہوا روانہ
تارے سب ایک ایک کرکے
آگے پیچھے چلے قمر کے
مشرق میں ہے نور ہلکا ہلکا
ظلمت کا ظہور ہلکا ہلکا
صبح بن کر عروس تازہ
آئی مَل کر شفق کا غازہ
آئی اور کس ادا سے آئی
شانوں پہ کاکلیں رلائی
چہرہ اس کا یعنی وہ خورشید
بے پردہ عدوئے حسرت دید
ہر چیز کو پرتو سحر سے
قدرت نے رنگا ہے رنگ زر سے
جمنا ابھی خواب سے اٹھی ہے
پیدا بشرے سے تازگی ہے
کرنیں جمنا سے کھیلتی ہیں
ظلمت کو پرے ڈھکیلتی ہیں
ہے محو خرام ناز جمنا
عشاق کی دل نواز جمنا
ساحل، یہ دوب، دوب پر اوس
مخمل تو ہے دوب اور گہر اوس
جمنا کا لباس مخملی ہے
اور موتیوں سے لدی کھڑی ہے
جنگل کے وہ پھول آہ خودرو
بھینی بھینی وہ اُن کی خوشبو
دھیمے دھیمے صبا کے جھونکے
انداز خرام وہ گلوں سے
طائر ہر سمت نغمہ زن ہے
یہ مطرب محفل چمن ہے
ہر چند ہے دل پذیر جمنا
کب دل کو مگر یہاں ہے تھمنا

ہے ذوق لقائے شام ہم کو
جمنا سے نہیں ہے کام ہم کو
مل جائے کہیں کہیں کنھیا
آرام دل حزیں کنھیا

بیدل عظیم آبادی

۴۔ موسم بہار

شعاعِ خورشید موسمِ گل سے ذرّہ ذرّہ ہے جلوہ پیرا
بہارِ گلشن کی آمد آمد منا رہا ہے چمن کا نقشا
کہیں ہیں شبنم سے دُر و گوہر ورق ورق پر شجر شجر کے
کہیں ہے آبِ رواں کی چادر کہیں یہ مخمل کا ہے بچھونا
عجب ہے عالم میں دورِ مستی ہر اک ہے مشغول مے پرستی
گلاب ساغر بکف اگر ہے تو دستِ لالہ میں ہے پیالا
قسم ہے بلبل کی عاشقی کی غضب ہے رنگت کلی کلی کی
یہ چہرے ہنستے ہوئے گلوں کے، یہ رنگ نکھرا ہوا چمن کا
اِدھر وفورِ شمیمِ گل ہے، اُدھر کمالِ نموئے لالہ
مہک رہا ہے تمام گلشن، لہک رہا ہے تمام صحرا

جنوں فزا کوک کوئلوں کی، غضب پپیہا کی پی کہاں ہے
چٹاک کلی کی ہے ایک آفت ستم ہے بلبل کا ہر ترانا
کسی کا دل رنگ و بو پہ مائل، کوئی ہے زرہائے گل کا سائل
غرض ہر اک عاشق ستم کش کے دل میں ہے آج اک تمنا
شگوفہ ریزیٔ شاخِ گل میں عجیب اک طرزِ دلنشیں ہے
خرامِ نازِ نسیمِ دلکش، صبا کی رفتار راحت افزا
ریاضِ عالم کی لالہ کاری ہوئی ہے سامانِ عیش و شادی
چمک رہا ہے ہر ایک چہرہ دمک رہا ہے رُخِ تمنا
سماں گلستاں کا جاں فزا ہے، نظر فریب اس قدر فضا ہے
کہ نرگسِ گلشن بھی بلبلوں سے کیے ہے وا دیدۂ تماشا
گلوں سے شاخیں بھری ہوئی ہیں شجر پھلوں سے لدے ہوئے ہیں
کلی کلی ہے ورق ورق میں خدا کی قدرت کا اک نمونا
نہاں ہر اک شے میں رازِ حکمت ہر اک ذرّہ میں سرِّ صنعت
مگر وہی سمجھے یہ حقیقت، جو اس کی قدرت کا ہو شناسا
بہار ہو یا خزاں ہو بیدلؔ ہر ایک حالت میں اک مزہ ہے
جو سرِّ جلوہ سے باخبر ہیں، انھیں پہ یہ راز ہے ہویدا

شمس منیری

۵۔ پروانہ

پروانے! تجھے یہ کیا ہوا ہے — تو کس کا طواف کر رہا ہے
اس شمع میں روشنی ہے کس کی — دل میں ترے لو لگی ہے کس کی
کیوں وقفِ صد اضطرار تو ہے — کس واسطے بے قرار تو ہے
بیتابیٔ دل تری عیاں ہے — جذبہ کے اسی کے پر فشاں ہے
شورش سی یہ تیرے دل میں کیا ہے — سچ کہہ ترے آب و گل میں کیا ہے
یہ آخر شب یہ وقت راحت — ہر چیز ہے مست خوابِ غفلت
چپ چاپ وحوش ہیں کھٹوں میں — خاموش طیور گھونسلوں میں
انساں بھی ہو گئے ہیں خاموش — بستر پہ پڑے ہیں کیسے مدہوش
اک شمع کہ شمعِ انجمن تھی — رونق وہ محفلِ سخن تھی
تنہا کھڑی ٹمٹما رہی ہے — روتی ہوئی مسکرا رہی ہے
اک وہ ہے اور ایک تو ہے بیدار — تم دونوں میں کچھ تو ہے سروکار
یہ راز و نیاز تم میں کیا ہے — یہ سوز و ساز تم میں کیا ہے
کیوں دل ترا وقفِ صد تپش ہے — کیا شعلۂ شمع میں کشش ہے
کیوں تجھ کو ہے اضطراب ایسا — ہے کس کے لئے خراب ایسا

کیوں رقص میں مست تو ہے پیہم ۔ کیوں وجد کا ہر گھڑی ہے عالم
کیوں شعلہ پہ جان دے رہا ہے ۔ پھر پھر کے بلائیں لے رہا ہے
کیوں سر کو لگن پہ مارتا ہے ۔ کیوں شمع پہ جان وارتا ہے
کیوں آگ میں جی جلا رہا ہے ۔ کیوں موت کے منہ میں جا رہا ہے
کیوں شمع کی لَو کو چومتا ہے ۔ کیوں آ کے مزے میں جھومتا ہے
آیا تو ہے جھپٹ کے لَو پر ۔ جل جائے گا آگ سے لپٹ کر
کیوں تجھ کو ہے اشتیاقِ سوزش ۔ کیوں دل میں ہے یہ مذاقِ سوزش
کیا یہ ہی کمالِ زندگی ہے ۔ سوزش ہی مآلِ زندگی ہے
ننھا سا وہ دل ترا کہاں ہے ۔ جس سے تپ و تاب یہ عیاں ہے

رکھ دے مرے سینہ میں وہی دل
اپنا سا بنا دے مجھ کو بسمل

اختر شیرانی

حُسنِ معصوم

تمام بستی کو آگ اک آتشیں ترانہ سنا رہی تھی
فضائے شب گوں میں سرخ شعلوں کا تند طوفاں اٹھا رہی تھی
مکان ہو یا مکیں ہو ہر اک کو اک سرے سے جلا رہی تھی
بھڑکتی، بڑھتی، مچلتی، اٹھتی، تڑپتی، لہراتی آ رہی تھی

غریب لوگوں کے شور و شیون سے ایک ہنگامہ سا بپا تھا
خدا کا قہر ایک آتشیں سیل بن کے گویا اُبل پڑا تھا

غرض، جہاں یہ مہیب شعلے ہر اک مکاں کو جلا چکے تھے
وہیں کسی خستہ جاں کے گھر کو بھی شعلہ ساماں بنا چکے تھے

مکیں تھے جتنے وہاں ہر اک کا چراغ ہستی بجھا چکے تھے
بس ایک ننھی سی جاں تھی جس پر ابھی وہ قابو نہ پا چکے تھے

ادھر سے شعلوں میں گھر رہی تھی، اُدھر سے شعلوں میں گھر رہی تھی
یہاں، وہاں، گرتی پڑتی، دیوانہ وار کمرے میں پھر رہی تھی

وہ اُس کا معصوم و سادہ حسن، اور وہ اس کا چہرہ گلاب کا سا
وہ کچھ رسیلی کنول سی آنکھیں، وہ اُن میں نشہ شراب کا سا

وہ اس کی مبہوت بے حجابی، وہ اس پہ عالم حجاب کا سا
وہ اس کی شاداب کمسنی اور وہ اس کا نقشہ شباب کا سا

وہ بال جن پہ گماں تھا، ان سے ہزاروں راتیں چھلک پڑیں گی
وہ لب کہ ہر دم خیال ہوتا تھا، اب شرابیں چھلک پڑیں گی

وہ اک پری تھی کہ آسماں سے کوئی ستارہ اُچھل پڑا تھا
کہ خلد کا کوئی پھول، اس تیرۂ خاکداں میں مچل پڑا تھا

شراب کوثر کا جاندار اک حسین قطرہ اُبل پڑا تھا
کہ ذہن فطرت سے اک اچھوتا خیال باہر نکل پڑا تھا

یقیناً ایسی کہ شاعر آہنگ فکر کا منتہا بنا لیں
اور اس سے آگے بڑھیں تو مجھ کو خبر نہیں کیا سے کیا بنا لیں
غرض کہ قسمت جب اس کو ان ہولناک شعلوں میں کھینچ لائی
ستارے غصہ سے کانپ اٹھے زمیں دہشت سے تھرتھرائی
یہ دیکھ کر دست ابرِ رحمت نے اپنی دریادلی دکھائی
اشارہ پاکر بہشت سے ایک ماہِ تمثال اڑ کے آئی
خیال کی آنکھ دیکھتی ہے کہ آگ ساری بجھی پڑی ہے
اور ایک لڑکی کو حور آغوشِ نازنیں میں لئے کھڑی ہے

احسان بن دانش

۷۔ اثرات رباب

سرمہ افشاں ہے آسماں کی نگاہ — کروٹیں لے رہا ہے ابرِ سیاہ
تر ہے ہلکی پھوار سے جنگل — ہر طرف راستوں میں ہے دلدل
ٹھنڈی ٹھنڈی سنک رہی ہے ہوا — بوئے گل سے مہک رہی ہے فضا
دم بخود ہیں نشیمنوں میں طیور — جانے کس نے کھلا دیا سیندور
نہر کے پُرسکوں کنارے پر — ہے جوانی کا خواب گوں منظر
برق رہ رہ کے تلملاتی ہے — ہر حسیں موج مسکراتی ہے

اس طرح کچھ خموش ہے جنگل
گویا حیرت بدوش ہے جنگل
روشنی چرخ کے ستاروں کی
بن گئی شمع لالہ زاروں کی
ایک سادھو درخت کے نیچے
بانٹتا ہے ہواؤں کو نغمے
زخم پرور ستار کی آواز
کر رہی ہے فضاؤں میں پرواز
ایسا محسوس ہو رہا ہے مجھے
جیسے کوئی کھگو رہا ہے مجھے
صبح جس طرح انجمنستاں میں
ہچکیاں جیسے یادِ جاناں میں
جیسے مغموم دوست کی آواز
جسم سے روح جب کرے پرواز
جیسے کالی گھٹا سے بارش کا
منہ اندھیرے حقیقت سا چھینٹا
جیسے وقتِ سحر پسِ ماتم
تھرتھراتی اذان کا عالم
جیسے افلاس میں بروزِ عید
غیر ملکوں میں ہم وطن کی دید
حسن برسات کا ہے یہ آواز
راگ سے جاگتا ہے دل کا ساز
کاش اس وقت جان نکل جائے
خواب تعبیر سے بدل جائے

مجاز ردولوی

۸۔ رات اور ریل

پھر چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی
نیم شب کی خامشی میں زیرِ لب گاتی ہوئی

ڈگمگاتی، جھومتی، سیٹی بجاتی، کھیلتی
وادی و کہسار کی ٹھنڈی ہوا کھاتی ہوئی

تیز جھونکوں میں وہ چھم چھم کا سرودِ دل نشیں
آندھیوں میں مینھ برسنے کی صدا آتی ہوئی

جیسے موجوں کا ترنم، جیسے جل پریوں کا گیت
ایک اک لے میں ہزاروں زمزمے گاتی ہوئی

ٹھوکریں کھاتی، لچکتی، گنگناتی، جھومتی
سر خوشی میں گھنگھروؤں کی تال پر گاتی ہوئی

رات کی تاریکیوں میں جھلملاتی، کانپتی
پٹریوں پر دور تک سیماب چھلکاتی ہوئی

جیسے آدھی رات کو نکلی ہو اک شاہی برات
شادیانوں کی صدا سے وجد میں آتی ہوئی

منتشر کر کے فضا میں جا بجا چنگاریاں
دامنِ موجِ ہوا میں پھول برساتی ہوئی

تیز تر ہوتی ہوئی منزل بہ منزل دم بہ دم
رفتہ رفتہ اپنا اصلی روپ دکھلاتی ہوئی

اک بگولے کی طرح بڑھتی ہوئی میدان میں
جنگلوں میں آندھیوں کا زور دکھلاتی ہوئی

رعشہ براندام کرتی انجمِ شب تاب کو
آشیاں میں طائرِ وحشی کو چونکاتی ہوئی
یاد آجائے پرانے دیوتاؤں کا جلال
ان قیامت خیزیوں کے ساتھ بل کھاتی ہوئی
ایک رخشِ بے عناں کی برق رفتاری کے ساتھ
خندقوں کو پھاندتی ٹیلوں سے کتراتی ہوئی
پل پہ دریا کے دمادم کوندتی، للکارتی
اپنی اس طوفان انگیزی پہ اتراتی ہوئی
پیش کرتی بیچ ندی میں چراغاں کا سماں
ساحلوں پر ریت کے ذرّوں کو چمکاتی ہوئی
مرغزاروں میں دکھاتی جوئے شیریں کا خرام
وادیوں میں ابر کے مانند منڈلاتی ہوئی
اک پہاڑی پر دکھاتی آبشاروں کی جھلک
اک بیاباں میں چراغِ طور دکھلاتی ہوئی
جستجو میں منزلِ مقصود کی دیوانہ وار
اپنا سر دھنتی فضا میں بال بکھراتی ہوئی
چھیڑتی اک وجد کے عالم میں سازِ سرمدی
غیظ کے عالم میں منہ سے آگ برساتی ہوئی

رینگتی، مڑتی، مچلتی، تلملاتی، ہانپتی،
اپنے دل کی آتشِ پنہاں کو بھڑکاتی ہوئی
خود بخود روٹھی ہوئی، بپھری ہوئی، بکھری ہوئی
شورِ پیہم سے دلِ گیتی کو دھڑکاتی ہوئی
منہ میں گھستی ہے سرنگوں کے یکایک دوڑ کر
دندناتی، چیختی، چنگھاڑتی، گاتی ہوئی
آگے آگے جستجو آمیز نظریں ڈالتی
شب کے ہیبت ناک نظاروں سے گھبراتی ہوئی
ایک مجرم کی طرح سہمی ہوئی، سمٹی ہوئی
ایک مفلس کی طرح سردی میں تھرّاتی ہوئی
تیزیٔ رفتار کے سکّے جماتی جا بجا
دشت و در میں زندگی کی لہر دوڑاتی ہوئی
ایک سرکش فوج کی صورت علم کھولے ہوئے
ایک طوفانی گرج کے ساتھ درّاتی ہوئی
ایک اک حرکت سے اندازِ بغاوت آشکار
عظمتِ انسانیت کے زمزمے گاتی ہوئی
ڈالتی بے حس چٹانوں پر حقارت کی نظر
کوہ پر ہنستی، فلک کو آنکھ دکھلاتی ہوئی

دامنِ تاریکیِ شب کی اُڑاتی دھجیاں
قصرِ ظلمت پر مسلسل تیر برساتی ہوئی
زد میں کوئی چیز آجائے تو اس کو پیس کر
ارتقائے زندگی کے راز بتلاتی ہوئی

زُعم میں پیشانیِ صحرا پہ ٹھوکر مارتی
پھر سُبک رفتاریوں کے ناز دکھلاتی ہوئی
ہر قدم پر توپ سی گھن گرج کے ساتھ ساتھ
گولیوں کی سنسناہٹ کی صدا آتی ہوئی

وہ ہوا میں سیکڑوں جنگی دُہل بجتے ہوئے
وہ بگُل کی جاں فزا آواز لہراتی ہوئی

الغرض اُڑتی چلی جاتی ہے بے خوف و خطر
شاعرِ آتش نفس کا خون کھولاتی ہوئی

۳۔ حکمت و موعظت

اکبر الہ آبادی

۱۔ چشمِ باطن

میں نے مرشد سے کیا جاکر یہ اک دن التماس   کارِ دنیا نے بہت مجھکو کیا ہے اب اُداس

جلوۂ دنیا نے مجھ کو کر دیا ہے بے بصر آخرت پر کچھ نہیں باقی رہی میری نظر
فلسفہ نے مجھ کو دکھلایا فقط دنیا کا فیکٹ میری چشمِ طمع کو عارض ہے عزلی کیٹریکٹ
میرے حق میں کوئی فارسالولیشن کیجئے ہو سکے تو مذہبی اک آپریشن کیجئے
کی توجہ حضرتِ مرشد نے میرے حال پر اک نظر ڈالی میرے اقوال اور اعمال پر
چشمِ باطن میں دیا نشتر نگاہِ تیز کا کٹ گیا وہ زنگ محسوسات کفر انگیز کا

پھر درِ دل پر مرے تقویٰ کی ٹٹی باندھ دی
آنکھ پر شوقِ لقائے حق کی پٹی باندھ دی

شاد عظیم آبادی

۲- اگلے پچھلے لوگ

وہ صورتیں متبرک وہ ان کی شان و شکوہ
مہذبانہ وہ باتیں وہ حسبِ فرا گفتار
ہر اک کو وضع کا پاس اپنے دوستوں کا لحاظ
لبوں پہ خلق کی باتیں دلوں میں صبر و قرار
کسی کو نثر کا ذوق اور کسی کو نظم کا شوق
فقیہہ و صاحبِ تقویٰ و کاسب و احرار
وہ دوستوں سے عزیزوں کی طرح مل جاتا
برائیوں سے کنارہ شکایتوں سے عار

سُنو غریبوں کی حالت امیر تو ہیں امیر
مجال کیا جو کریں اپنے حال کا اظہار
نہ نکلیں گھر سے، جو نکلیں تو شان سے نکلیں
کہ اپنے ہاتھ سے جانے نہ پائے اپنا وقار
بشاشتیں وہی، مُنہ پر ہزار ہو تکلیف
طلب کا نام نہ لائیں زبان پر زنہار
لئے دئے ہوئے اور آبرو بنائے ہوئے
کہ تا نہ سمجھے کوئی اُن کو مفلس و نادار
مہذّب ایسے کہ تھے جاہل بھی اُس زمانہ کے
کہ اہلِ علم میں کرلے زمانہ اُن کو شمار
محاوروں میں وہ شیرینیاں کہ صلّ علےٰ
وہ جب کریں تو بہ آہستگی کریں گفتار
جھکائے سر کو شرافت سے راستہ چلنا
ادب سے ہاتھ اُٹھانا سلام کو ہر بار
کریں غریب کا تا بہ فرش استقبال
بہت لحاظ کہ آئے نہ ان کے دل پہ غبار
لحاظ بھائیوں تک میں بھی باپ بیٹوں کا
یہ کیا مجال کہ مرکز سے بڑھ کے ہو گفتار

ہر ایک حفظِ مراتب میں تکملہ حاصل
ہر اک سے جھک کے تعارف صغار ہوں کہ کبار
بہادرانہ امنگیں سپاہیانہ شوق
جریب دست مبارک میں اور کمر میں کٹار
کوئی جگہ کوئی صحبت نہیں کہ ہوں نہ وہاں
مورخ و شعراء و ادیب و نثر نگار

افسر میرٹھی

۳۔ فلسفۂ کامیابی

جو سب سے بدتر تھے اس جہاں میں، ہیں ان کے وارث ہی سب سے بہتر
رکاوٹیں جس قدر ہوں پیدا، اسی قدر کامیاب ہوں گے
یہ چھاؤں جس سے گزر رہے ہو، ثبوت بین ہے دھوپ کا خود
شکست کا لطف پا چکے ہو، تو ایک دن فتح یاب ہو گے
خزاں اجاڑے گی جس چمن کو، بہار آئے گی اس چمن میں
اسے خوشی بھی نہ ہو گی حاصل، جسے کبھی غم نہیں رہا ہے
خدا رسیدہ بزرگ ہونا، اسی سے ممکن ہے اس جہاں میں
گناہ گاروں میں جو یہاں کے، کسی سے کچھ کم نہیں رہا ہے



حامدالله افندی

جو بےبسی میں گرے ہیں افسر، وہی تو گہرائی سے ہیں واقف
جو دل سے نکلا ہے کوئی نالہ، فلک پر وہ با اثر رہا ہے
بلندیوں پر وہی چڑھے گا، نشیب میں جو اُتر سکے گا
جو چوٹیوں پر گیا ہے رستہ، وہ گھاٹیوں سے گزر رہا ہے

جوش ملیح آبادی

۴۔ بجھی ہوئی شمع

مفلس ہوئے تو دہر میں عزت نہیں رہی　　آنکھوں میں دوستوں کے مروت نہیں رہی
محبوب کی نظر میں بھی اُلفت نہیں رہی　　حد یہ ہے ماں کی آنکھ میں شفقت نہیں رہی

دریائے بے کنارِ جوانی اُتر گیا
موتی کی قدر کیا ہو جو پانی اُتر گیا

وہ زمزمے، وہ لَے، وہ ترنم نہیں رہا　　وہ چہچہے، وہ لطفِ تکلم نہیں رہا
وہ بحرِ دلبری میں تلاطم نہیں رہا　　ہونٹوں پہ دوستوں کے تبسم نہیں رہا

جو دل سے تھے فدا، وہی دل توڑنے لگے
جو ہاتھ چومتے تھے، وہ منہ موڑنے لگے

مفلس کو ہیچ ہے کے دھیان میں لاتا نہیں کوئی　　بے زر کو اپنے پاس بٹھاتا نہیں کوئی
بے آب آئینے کو، اُٹھاتا نہیں کوئی　　روتے ہوؤں سے آنکھ ملاتا نہیں کوئی

چہرے سے آب اُڑی تو کوئی جانتا نہیں
دشمن تو کیا ہیں، دوست بھی پہچانتا نہیں
بگڑی جو بات خلق کے تیور بگڑ گئے — ملتے تھے جھک کے جو وہ یکایک اکڑ گئے
میداں سے پاؤں اہلِ وفا کے اُکھڑ گئے — دم میں شبانہ روز کے ساتھی بچھڑ گئے
دوشِ صبا پہ رات کے افسانے اُڑ گئے
گُل ہوگئی جو شمع، تو پروانے اُڑ گئے

۵۔ آدم کی پیدائش

ذرّہ ذرّہ سے اُٹھی اِک تازہ موجِ زندگی
آسمانوں نے علم کھولے، زمیں نے سانس لی
بھاپ بن کر چھائی میدانوں میں روحِ بحر و بر
دید کی خاطر پہاڑوں نے اُٹھائے اپنے سر
خفتہ میدانوں میں شہروں کا تخیل جاگ اُٹھا
ایک پرتو سا در و دیوار پر پڑنے لگا
لیلیِ تعمیر کا رخسار لو دینے لگا
گونج اُٹھی کہسار کے سینے میں تیشہ کی صدا
حکمِ قدرت کو لئے موجِ ہوا آنے لگی
"با ادب با ہوش" کی پیہم صدا آنے لگی

ذوقِ ایجادات وصنعت کا بگل بجنے لگا
آئی طبلِ عالمِ خاکی سے 'دوں دوں' کی صدا
سنسنائی سینۂ فولاد میں تیغِ دودم
پتھروں میں کسمسائے ناتراشیدہ صنم
اپنے میثاقِ اطاعت کے سنانے کے لئے
آئیں ساری قوتیں عالم کی صف باندھے ہوئے
سامنے آ کے آشیانے بنائے اپنے نام
ہو نکتے بیچ سے عناصر نے کیا جھک کر سلام
احتراماً قدِ آدم بحر کی موجیں اٹھیں
تند طوفانوں کی اکڑی گردنیں خم ہو گئیں
رکھ کے کشتی میں خواص این و آں مثل خراج
نذر کو آیا قوائے کارفرما کا مزاج
جھک گئی ہستی مؤدب ہو گئے ارض و سما
شاہدانِ دہر نے وا کر دئے بندِ قبا
روشنی کو سینۂ ظلمت میں راہیں مل گئیں
خاک کے در کھل گئے کانوں کی باچھیں کھل گئیں
نوعروسِ دہر نے زلفوں کو برہم کر دیا
چاند مجرے کو جھکا سورج نے سر خم کر دیا

۶۔ سُراغِ رہرو

جہاں زمیں پہ رگڑ کا نشاں ہویدا ہے دلیل اسکی ہے سانپ اس طرف سے گزرا ہے
نشاں ہلال نما راہ میں بتاتے ہیں کہ گھوڑی دور پہ آگے سوار جاتے ہیں
غبارِ راہ نشاں ہے کسی تگ و پو کا یقین ہوتا ہے نقشِ قدم سے رہرو کا
ٹپک کے جھاڑیوں سے خون یہ بتاتا ہے کہ زخم کھا کے اِدھر سے شکار بھاگا ہے
صنم تراش نہ ہو تو صنم نہیں بنتا قدم نہ ہو تو نشانِ قدم نہیں بنتا
یوں ہی یہ راہ کہ ہے جس کا نام کاہکشاں یوں ہی یہ نقشِ قدم "ماہ و نیرِ تاباں"
یوں ہی یہ گردِ سرِ راہ خوشنما تارے رواں ہیں جن کی جبینوں سے حسن کے دھارے
زمیں کا نور ہیں اور آسماں کی زینت ہیں
کس کی شوخیٔ رفتار کی علامت ہیں

حفیظ جالندھری

۷۔ شہر پومپئی کی آخری شب

سیاہی بن کے چھایا شہر پر شیطان کا فتنہ
گناہوں سے لپٹ کر سو گیا انسان کا فتنہ
دلِ شہر میں زری کے شامیانے خوش نصیبی کو
اُڑھا دی سایۂ دیوار نے چادر غریبی کو

مشقّت کو سکھا کر خوبیاں خدمت گزاری کی
ہوئیں بے خوف بے ایمانیاں سرمایہ داری کی
لیا آغوش میں پھولوں کی سیجوں نے امیری کو
مہیا خاک ہی نے کردئے آسن فقیری کو
تڑپنا چھوڑ کر چُپ ہو چکے جی ہارنے والے
مزے کی نیند سوئے تازیانے مارنے والے
وہ روحانی و جسمانی عقوبت کم ہوئی آخر
غلامی بیڑیوں کے بوجھ سے بیدم ہوئی آخر
ہوئے فریادیوں پر بند ایوانوں کے دروازے
کہ خود محتاج درباں ہیں جہانبانوں کے دروازے
بڑے انداز سے جاسوسی غفلت بادشاہوں کی
سرور کیف بن کر چھا گئیں نیندیں گناہوں کی
رباب خواب نے مسحور کیں جانیں نجیبوں کی
سُلا کر بزم میں کو سو گئیں تانیں گویّوں کی
شرابیں ختم کر کے ہو گئے خاموش ہنگامے
بالآخر نیند آئی سو گئے پُرجوش ہنگامے
تھما جب زندگی کا جوش پر خاشِ عمل جاگی
عمل کو دیکھ کر مدہوش پاداشِ عمل جاگی

اُٹھایا موت نے بیتھر جہنّم کے دہانے سے
جہاں آتش کا دریا کھولتا تھا اِک زمانے سے
بلندی سے تباہی کے سمندر نے کیا دھاوا
چٹانوں کے جگر سے پھوٹ نکلا آتشیں لاوا
دکھادی آگ ایوانوں کو مظلومی کی آہوں نے
اُٹھائے شعلہ ہائے آتشیں بیکس نگاہوں نے
نہ حُسن و عشق نے پائی اماں قہرِ الٰہی سے
دبی پاداش اسیری سے فقیری سے نہ شاہی سے
اُٹھیں مختار بن کر بیکسی کے خون کی موجیں
حصارِ موت نے محصور کرلیں جنگجو فوجیں
ستاروں کی نگاہوں نے دھواں اُٹھتا ہوا دیکھا
مگر خورشید نے کچھ بھی نہ مٹی کے سوا دیکھا

وطن و ملت

اکبر الہ آبادی

۱۔ دربار ۱۹۱۱ء

دیکھ آئے ہم بھی دو دن رہ کے دہلی کی بہار
حکمِ حاکم سے ہوا تھا اجتماعِ انتشار

آدمی اور جانور اور گھر مزین اور مشین
پھول اور سبزہ چمک اور روشنی اور ریل و تار
کیروسین اور برق اور پٹرولیم اور تارپین
موٹر اور ایروپلین اور جگمگھٹے اور اقتدار
مشرقی ہیکلوں میں تھی خدمت گزاری کی امنگ
مغربی شکلوں سے شانِ خود پسندی آشکار
شوکت و اقبال کے مرکز حضورِ امپرر
زینت و دولت کی دیوی امپرس عالی وقار
بحرِ ہستی لے رہا تھا بے دریغ انگڑائیاں
ٹیمز کی امواج جمنا سے ہوئی تھی ہمکنار
انقلابِ دہر کے رنگین نقشے پیش تھے
تھی بپئے اہلِ بصیرت باغِ عبرت میں بہار
ذرّے ویرانوں سے اٹھتے تھے تماشا دیکھنے
چشمِ حیرت بن گئی تھی گردشِ لیل و نہار
مصلحت آمیز ہر طرز و طریقِ انتظام
حکمت آگیں ہر ادائے حاکمانِ نامدار
جامے سے باہر نگاہِ نازِ فتاحانِ ہند
حدِ قانونی کے اندر آنریلوں کی قطار

خرچ کا ٹوٹل دلوں میں چٹکیاں لیتا ہوا
فکرِ ذاتی میں خیالِ قوم غائب فی المزار
دعوتیں، انعام، اسپیچیں، قواعد، فوج، کمپ
عرقتیں، خوشیاں، امیدیں، احتیاطیں، اعتبار
پلیٹ ِروشاہی تھی پھر ہز ہائنس پھر اہلِ جاہ
بعد اس کے شیخ صاحب ان کے پیچھے خاکسار

اقبال

۲۔ شعاعِ امید

(۱)

سورج نے دیا اپنی شعاعوں کو یہ پیغام
دنیا ہے عجب چیز، کبھی صبح کبھی شام
مدت سے تم آوارہ ہو پہنائے فضا میں
بڑھتی ہی چلی جاتی ہے بے مہریٔ ایام
نے ریت کے ذروں پہ چمکنے میں ہے راحت
نے مثلِ صبا طوفِ گل و لالہ میں آرام!
پھر میرے تجلی کدۂ دل میں سما جاؤ
چھوڑو چمنستان و بیابان و در و بام

(۲)

اک شوخ کرن، شوخ مثالِ نگہِ حور
آرام سے فارغ صفتِ جوہرِ سیماب

بولی کہ مجھے رخصتِ تنویر عطا ہو — جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرہ جہاں تاب
چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو — جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز — اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب

چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن — یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِ ناب

اس خاک سے اُٹھے ہیں وہ غواصِ معانی — جن کے لئے ہر بحرِ پُر آشوب ہے پایاب
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں — محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب!
بُت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن — تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب!

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

روش صدیقی

٣۔ اے کشورِ ہندوستاں

اونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں

اے خلد سے لائی ہوئی رنگیں بہاروں کے وطن
کوثر ہے جن میں موجزن اُن آبشاروں کے وطن
نازاں ہے جن پر ایشیا، اُن کوہساروں کے وطن
بے کیف تیرے سامنے افسانۂ باغِ جناں

اے کشورِ ہندوستاں
اونچا رہے تیرا نشاں
تھا زندگی کے نور سے معمور کاشانہ ترا
اے شمعِ تہذیبِ کہن، عالم تھا پروانہ ترا
خورشید و انجم کو کبھی ہے یاد افسانہ ترا
وہ عہدِ زرّیں آج تک بھولا نہیں ہے آسماں
اے کشورِ ہندوستاں
اونچا رہے تیرا نشاں
ہمدوش شیخ و برہمن، اُٹھے ہیں تیری گود سے
پروانۂ شمعِ وطن، اُٹھے ہیں تیری گود سے
غازی، مجاہد، صف شکن، اُٹھے ہیں تیری گود سے
جن کا غبارِ کارواں ہے آج خضرِ کارواں
اے کشورِ ہندوستاں
اونچا رہے تیرا نشاں
حُبِّ وطن کی لہر ہے بیگانۂ زنجیر پھر
ہلنے لگی ہے ظلم و استبداد کی تعمیر پھر
آزادیوں کے خواب ہیں دامن کشِ تعبیر پھر
پھر انقلابِ دہر نے بدلا ہے اندازِ جہاں

اے کشورِ ہندوستاں
اونچا رہے تیرا نشاں
پھر شعلہ افشاں زمزمے، آتش زنِ مضراب ہیں
پھر ولولوں کی تیز موجیں، عالمِ سیلاب ہیں
پھر نوجوانِ ہند کی ہر سانس میں بے تاب ہیں
بیداریوں کے قافلے آزادیوں کے کارواں
اے کشورِ ہندوستاں
اونچا رہے تیرا نشاں
ہے زیبِ دامانِ شفق، خونِ شہیدانِ وطن
گہوارۂ خورشید ہے چاکِ گریبانِ وطن
پیغمبرِ صبحِ وطن، ہیں نوجوانانِ وطن
افتاں و خیزاں بھاگتی جاتی ہیں سب تاریکیاں
اے کشورِ ہندوستاں
اونچا رہے تیرا نشاں
جنّت کو پھر تیری فضاؤں میں بسایا جائے گا
آزادیٔ افکار کا مژدہ سنایا جائے گا
انسانیت کا تجھ کو گہوارہ بنایا جائے گا
وہ دن بہت نزدیک ہے از فضلِ ربِّ دوجہاں

اے کشورِ ہندوستاں
اونچا رہے تیرا نشاں

۴ ۔ سلطان شہید

(مجاہدِ وطن ٹیپو سلطان شہید کی یاد میں)

اے شجاعِ ازل، اے ہند کے فرزندِ جلیل
زندگی خود ہے ترے ذوقِ شہادت کی قتیل
نامرادی تری آئینِ وفا کی تکمیل

رزم آرا علم جیشِ صداقت تجھ سے
زندہ ہے آج بھی مشرق کی شجاعت تجھ سے

لے گئی عرشِ وفا پر تجھے تقدیر تری!
گونجتی ہے ابھی آفاق میں تکبیر تری!
عدل کے ہاتھ میں ہے آج بھی شمشیر تری!

لبِ اقوام پہ جاری ترا افسانہ ہے
سوزِ آزادیٔ مشرق ترا پروانہ ہے

تو ہے وہ بحر، جو شرمندۂ ساحل نہ ہوا
وہ مجاہد ہے جو آسودۂ منزل نہ ہوا

مصلحت سے کبھی مانوس ترا دل نہ ہوا
عشق سے مرگ کے شعلوں کو بجھایا تو نے
جاوداں ہستیٔ فانی کو بنایا تو نے

تری جرأت تھی غمِ سود و زیاں سے آزاد
تو رہا گردشِ دورانِ جہاں سے آزاد
ہے تری یاد زماں اور مکاں سے آزاد
باطل افگن ہے ترا نعرۂ آزاد ابھی
ہے ترے نام سے لرزاں ستم ایجاد ابھی

ہند کو محرمِ اسرارِ وفا تو نے کیا
حق وفاداریٔ مشرق کا ادا تو نے کیا
کام جو سب کا تھا اے مردِ خدا تو نے کیا
حلقۂ جادوئے افرنگ کو توڑا تو نے
ہند میں پنجۂ شیطاں کو مروڑا تو نے

حریت، سرخیٔ نظمِ مہ و خورشید ہے پھر
انقلابات کی کچھ اور ہی تمہید ہے پھر
ہاں ترا عہدِ وفا عازمِ تجدید ہے پھر
پھر ہے بیدار جلال و حشمِ آزادی
وقت کے ہاتھ میں ہے پھر علمِ آزادی

ہند میں آج جو یہ جلوۂ بیداری ہے
سطوتِ غیر، جو مجبورنگوں ساری ہے
یہ ترے شعلۂ ایثار کی گلکاری ہے
سرِ تکمیل ترا جذب تمام آ پہنچا
صبحِ آزادیِ مشرق کا پیام آ پہنچا

نجم گیلانی

۵۔ جامِ شہادت

تڑپتا ہے تنہا وہ فرشِ زمیں پر   نہ غمخوار کوئی نہ تکیہ نہ بستر
اِدھر اس کی بندوق ٹوٹی پڑی ہے   گرا خاک پر ہے اُدھر اُس کا خنجر
نہ آتی ہے کانوں میں آوازِ ہمدم   کہ پانی پلائے اُسے ترس کھا کر

نہ توپوں کا شور اور نہ گولوں کی بارش   نہ گھوڑا نہ جھنڈا سپاہی نہ افسر
تعاقب میں دشمن کے سب چل دئے ہیں   عقب میں اسے چھوڑ حیران و مضطر
وہ حسرت سے چاروں طرف دیکھتا ہے   کبھی لیٹے لیٹے کبھی سر اٹھا کر
تباہی کے آثار ہر سو عیاں ہیں   بنی ہے زمیں خوں سے دریائے احمر
نہ گھر کی خبر ہے نہ غمخوار کوئی   نہ باپ اور بیٹا برادر نہ مادر

سرہانے کھڑی یہ اجل کہہ رہی ہے کہ اس زخمِ کاری سے ہوگا نہ جاں بر

اسی کشمکش میں وہ دم توڑتا ہے
گلستانِ ہستی سے منہ موڑتا ہے

مئے قوم و ملّت کے سرشار آؤ | بہادر سپاہی کا لاشہ اُٹھاؤ
وطن کی محبت میں مارا گیا ہے | اسے اُس کی خاکِ وطن میں سُلاؤ
بدن اس کا زخموں سے ہے چور سارا | ذرا قبر میں ہلکے ہلکے لٹاؤ
کھِلا کچھ نہ غنچہ اُمیدوں کا اس کی | تم اب اس کی تربت پہ کلیاں چڑھاؤ
کسی کے بھرے گھر کا یہ نور ہوگا | سرِ شام مرقد پہ شمعیں جلاؤ
کبھی غیر قوموں میں گر جا کے بیٹھو | تو اس کی دلیری کے قصّے سُناؤ
مصائب کا اس کی اگر دھیان آئے | تو آنکھوں سے آنسو کے قطرے گراؤ

وہ مذہب پہ اپنے فدا ہو گیا ہے
وہ فانی سے اہلِ بقا ہو گیا ہے

احسان بن دانش

۶۔ لکڑ ہارا

شعلہ افشاں ہے زمانہ بھر میں گرمی کا شباب
سوئے دنیا ٹکٹکی باندھے ہوئے ہے آفتاب

ہر کلی تولسنی ہوئی ہر پھول کمھلایا ہوا
خامشی ایسی کہ زناٹا سا اک چھایا ہوا
گرم لُو کا زور، گھبرائے ہوئے سے راستے
دھوپ کی تیزی میں تیورائے ہوئے سے راستے
نغمہ زن گرمی کی دیوی کا ربابِ آتشیں
آسماں سہما ہوا سا تمتماتی سی زمیں
گرد سے دھندلی فضا میں دم بخود گیہوں کے کھیت
سبزۂ مایوس پر تپتی ہوئی سڑکوں کی ریت
پتیاں سمٹی ہوئی شاخوں کا دم پھولا ہوا
طائروں کا نغمۂ تقدیس تک بھولا ہوا
روحِ دوزخ سینۂ صحرا پہ منڈلائی ہوئی
چرخ پر سیال آتش کی گھٹا چھائی ہوئی
راہ میں لو، کھیتوں میں تو لس، میداں میں تپش
جھونپڑی میں حبس کی شدت، بیاباں میں تپش
خلقِ عالم پر سکوتِ آتشیں چھایا ہوا
شاہِ خاور کا تکبر جوش میں آیا ہوا

(۲)

اس قیامت خیز منظر میں بصد خوف و ہراس
اک لکڑہارا ہے فرطِ تشنہ کامی سے اداس

لکڑیوں کا بوجھ سر پر، لب پہ آہِ جاں گداز
درد سے لبریز خاموشی حدیثِ غم طراز
پا برہنہ اور گھنی ڈاڑھی پہ خاکِ رہ گذار
پنڈلیوں پر راستے کی گرد، پلکوں پر غبار
فرطِ محنت سے پسینہ تا قدم بہتا ہوا
داستانِ ہمتِ قلب و جگر کہتا ہوا
بازوؤں پر مچھلیاں، تن پر شکستہ پیرہن
لڑکھڑاتے پاؤں، پیشانی پہ مردانہ شکن
دیدۂ خود دار میں سرخی، لبوں میں ارتعاش
لکڑیوں سے کہنیوں پر ہلکی ہلکی سی خراش
چلتے چلتے جب کوئی تلوے میں چبھ جاتا ہے خار
یہ نکلتا ہے زباں سے "رحم اے پروردگار"
سوچتا ہے، کیسے اٹھے گی اللہ العالمین
قرض خواہوں کے تقاضے سے نگاہِ شرمگیں

(۳)

یہ بلا کی دھوپ، یہ گرمی، یہ تپتی شاہ راہ
اور اس میں اک غریب انسان آف حالِ تباہ!

جس کی شریانوں میں ہو خونِ صلابت بے قرار
اُس کو بے رحمی سے پیسے آسیائے روزگار

جس کی آنکھوں میں صداقت کے تبسم کی پھبن
ہائے اس کا دل بنے معمورۂ رنج و محن!

بازوؤں میں جس کے مضطر حسرتِ مشقِ تفنگ
اُس کے بشرے سے نمایاں دردِ ناچاری کا رنگ

جس کی نظروں سے برستا ہو نجابت کا جلال
منعموں کے سامنے پھیلائے وہ دستِ سوال

عقل حیراں ہے عجب نظمِ جہاں آباد ہے
ایک انساں صید ہے اور دوسرا صیاد ہے

حفیظ جالندھری

۷۔ شہسوارِ کربلا

لباس ہے پھٹا ہوا
غبار میں اٹا ہوا
تمام جسمِ نازنیں چھدا ہوا کٹا ہوا

یہ کون ذی وقار ہے
بلا کا شہسوار ہے
کہ ہے ہزاروں قاتلوں کے سامنے ڈٹا ہوا
یہ بالیقین حسینؑ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

یہ جس کی ایک ضرب سے
کمالِ فنِّ حرب سے
کئی شقی گرے ہوئے تڑپ رہے ہیں کرب سے
غضب ہے تیغِ دو سر
کہ ایک ایک وار پر
اُٹھی صدائے الاماں زبانِ شرق و غرب سے
یہ بالیقین حسینؑ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

یہ کون حق پرست ہے
مئے رضا سے مست ہے
کہ جس کے سامنے کوئی بلند ہے نہ پست ہے

اُدھر ہزار گھات ہے
مگر عجیب بات ہے
کہ ایک سے ہزار کا حوصلہ شکست ہے
یہ بالیقین حسینؑ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

عبا بھی تار تار ہے
تو جسم بھی فگار ہے
زمیں بھی ہے تپی ہوئی فلک بھی شعلہ بار ہے
مگر یہ مردِ تیغ زن
یہ صف شکن فلک فگن
کمالِ صبر و تن دہی سے محوِ کارزار ہے
یہ بالیقین حسینؑ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

دلاوری میں فرد ہے
بڑا ہی شیر مرد ہے
کہ جس کے دبدبے سے دشمنوں کا رنگ زرد ہے

حبیبِ مصطفٰیؐ یہ ہے
مجاہدِ خدا یہ ہے
جبھی تو اس کے سامنے یہ فوج گرد برد ہے
یہ بالیقیں حسینؑ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

اِدھر سپاہِ شام ہے
ہزار انتظام ہے
اُدھر ہیں دشمنانِ دیں۔ اِدھر فقط امامؑ ہے
مگر عجب شان ہے
غضب کی آن بان ہے
کہ جس طرف اٹھی ہے تیغ بس خدا کا نام ہے
یہ بالیقیں حسینؑ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

۵۰

۵۔ پیغامات سر اقبال

۱۔ روحِ ارضی کا آدم سے خطاب

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ!
مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!

اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ!
ایامِ جدائی کے ستم دیکھ جفا دیکھ!

بے تاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ!

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں

یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں

آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ!
سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے!
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے!

۵۱

ناپید ترے بحرِ تخیل کے کنارے!
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے!
تعمیرِ خودی کر اثرِ آہِ رسا دیکھ!
خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں!
آباد ہے اِک تازہ جہاں تیرے ہُنر میں!
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں!
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں!
اے پیکرِ گِل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ!

ایضاً

۲- پیام

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے
سینہ ہے تیرا امیں، اس کے پیامِ ناز کا
جو نظامِ دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی ہے

دل کی کیفیت ہے پیدا پردۂ تقریر میں
کسوتِ مینا میں مے مستور بھی عریاں بھی ہے

پھونک ڈالا ہے مری آتش نوائی نے مجھے
اور میری زندگانی کا یہی ساماں بھی ہے

رازِ اس آتش نوائی کا مرے سینے میں دیکھ
جلوۂ تقدیر میرے دل کے آئینے میں دیکھ

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار
نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی

آ ملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی

شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی

دیکھ لو گے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موجِ مضطر ہی اسے زنجیرِ پا ہو جائے گی
نالۂ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور
خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

وحیدالدین سلیم

۳۔ اُمید کی کرن

خاتمہ تیرا اب اے ظلمتِ ہجراں ہوگا
صبحِ اُمید کا پھر جلوہ نمایاں ہوگا
منتظر شاہدِ مقصود کی رہتی ہے نگاہ
شعلۂ برق اسی تار پہ رقصاں ہوگا
خاک میں تخمِ تمنّا جو دبا یا تھا کبھی
اب وہی تخم نمو پا کے گلستاں ہوگا
زیرِ خاکستر پروانہ جو پنہاں تھا شرر
پھر بھڑک کر وہی شمعِ شبستاں ہوگا
پارۂ سنگ نے جھیلی ہے شعاعِ خورشید
اب بدل کر وہی اک لعلِ بدخشاں ہوگا
خون جب پنجۂ مژگاں سے ٹپکتا تھا کبھی
خوش نمائی سے وہ اب پنجۂ مرجاں ہوگا

پہلے جس دشت پہ پھیرا تھا اداسی نے قلم
اب وہی تختۂ مشقِ گل و ریحاں ہوگا

سیل جس دامنِ کہسار پہ رویا برسوں
اب وہی جوشِ گل و لالہ سے خنداں ہوگا

رہ چکا زردِ جمالِ رُخِ کنعاں جس میں
گلشنِ مصر وہی گوشۂ زنداں ہوگا

جس میں پالے نے نہ چھوڑا اثرِ نشو و نما
اب وہی نخلِ ثمر ریز و گل افشاں ہوگا

جس میں تھا اُمتِ موسیٰ کو ٹھہرنا مشکل
من و سلویٰ کا اسی دشت میں ساماں ہوگا

کل سکندر تھا اندھیرے میں جہاں سرگرداں
موج زن آج وہیں چشمۂ حیواں ہوگا

خاک اُڑاتا تھا جہاں غولِ بیاباں کا گروہ
گرمِ پرواز وہیں تختِ سلیماں ہوگا

ظلمتِ فصلِ خزاں چھائی تھی جس مسکن پہ
اب وہ پھولوں کی تجلّی سے چراغاں ہوگا

جلوۂ شاہدِ مقصود جو تھا زیرِ نقاب
روبرو چشمِ تماشا کے وہ عریاں ہوگا

یاس کی نیند سے اُٹھے گا جو آنکھیں ملتا
صبحِ اُمید کے جلوہ سے وہ حیراں ہوگا

یہ سماں دیکھ کے ہر غمزدہ مانندِ سلیم
وجد میں آ کے مسرت سے غزل خواں ہوگا

مجاز ردولوی

۴۔ نوجوان سے

جلالِ آتش و برقِ سحاب پیدا کر
اجل بھی کانپ اُٹھے وہ شباب پیدا کر

ترے خرام میں ہے زلزلوں کا راز نہاں
ہر ایک گام پہ اک انقلاب پیدا کر

صدائے تیشۂ مزدور ہے ترا نغمہ — تو سنگ و خشت سے چنگ و رباب پیدا کر
بہت لطیف ہے اے دوست تیغ کا بوسہ — یہی ہے جانِ جہاں اس میں آب پیدا کر
ترے قدم پہ نظر آئے محفلِ انجم — وہ بانکپن وہ اچھوتا شباب پیدا کر
ترا شباب امانت ہے ساری دنیا کی — تو خارزارِ جہاں میں گلاب پیدا کر
سکون خواب ہے بے دست و پا ضعیفی کا — تو اضطراب ہے خود اضطراب پیدا کر
نہ دیکھ زہد کی عصمت گنہ آلود — گنہ میں فطرتِ عصمت مآب پیدا کر
ترے جلو میں نئی جنتیں نئے دوزخ — نئی جزائیں، انوکھے عذاب پیدا کر
شراب کھینچی ہے سب نے غریب کے خوں سے — تو اب امیر کے خوں سے شراب پیدا کر
گرا دے قصرِ تمدن کہ اک فریب ہے یہ — اٹھا دے رسمِ محبت، عذاب پیدا کر
جو ہو سکے ہمیں پامال کر کے آگے بڑھ — نہ ہو سکے تو ہمارا جواب پیدا کر
بہے زمیں پہ جو میرا لہو تو غم مت کر — اسی زمیں سے مہکتے گلاب پیدا کر

تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

اختر اورینوی

۵۔ نوائے زندگی

قدم آگے بڑھاتا چلا جا — عزائم کے پرچم اڑاتا چلا جا

زمین و زماں پر تو چھاتا چلا جا　　خدائی پہ قبضہ جماتا چلا جا
دو عالم پہ سکہ بٹھاتا چلا جا

قیودِ غلامی مٹاتا چلا جا　　قصورِ تکبر گراتا چلا جا
سلاسل کے پرزے اڑاتا چلا جا　　مفاسد کی بنیاد ڈھاتا چلا جا
نئی ایک دنیا بناتا چلا جا

خمارِ تغافل سے سب کو جگاتا　　تباہی کے عفریت کا خوں بہاتا
فلاکت زدہ بستیوں کو جلاتا　　شبابِ ظفر مند کے گیت گاتا
ترقی کو رستہ دکھاتا چلا جا

کہیں قیصری کے مظالم سے آہیں　　یہ سرمایہ داری کی مہلک نگاہیں
شقاوت سعادت کی روکے ہے راہیں　　شیاطیں کے پنجوں میں انساں کراہیں
بغاوت کے طوفاں اٹھاتا چلا جا

دل و دست و بازو کو فولاد کر دے　　مصائب کی دنیا کو برباد کر دے
مسرت سے عالم کو آباد کر دے　　بنی نوعِ انساں کو دل شاد کر دے
ہر اک گام پہ گل کھلاتا چلا جا

جہاں گر نہیں تیری عظمت کا قائل　　زمانہ اگر ہے ستانے پہ مائل
حوادث کے زخموں سے گر ہے تو گھائل　　مصائب کے دریا جو ہوں رہ میں حائل
شجاعت کے جوہر دکھاتا چلا جا

قناعت یہ کیا کہہ دیا تو نے ہمدم　　نہیں ہے مرے زخمِ دل کا یہ مرہم

فراغت ہے روحِ بشر کے لئے سم　　عمل زندگی ہے عمل قاتلِ غم
تو رہوارِ ہمت بڑھاتا چلا جا

صداقت کا جب لُٹ رہا ہو خزانہ　　ہوا ایثار کا بدلہ جب تازیانہ
نگاہِ وفا جب محض ہو فسانہ　　محبت کی نظریں بھی ڈھونڈیں بہانہ
شرر بار نغمے سُناتا چلا جا

فسردہ ہوں جب نوجوانوں کے تیور　　نیاموں میں سڑتے ہوں شمشیر و خنجر
گرجتا ہو جب سامنے آکے عنتر　　دکھا بڑھ کے میداں میں تو زورِ حیدر
رجز پڑھتا کڑتا لڑتا چلا جا

نہ احساس کو دے فریبِ مسرت　　جنوں ہے فراغت مرض ہے فراغت
نہیں سرخوشی میں ہے پابندِ راحت　　عمل میں ہے جنت عمل سے ہے جنت
جہنم کو جنت بناتا چلا جا

فریبِ مے و نغمہ کھانے سے حاصل　　حسینوں کے جلوے بلا کے ہیں قاتل
فراغت فسوں ہے تعیش ہے باطل　　ہے منزل کا دھوکا نہیں ہے یہ منزل
فریبوں کے پردے ہٹاتا چلا جا

نہ غم زندگی ہے نہ سم زندگی ہے　　میں کیوں مان لوں پُر الم زندگی ہے
ہے دل جامِ جم، جامِ جم زندگی ہے　　مجاہد کی تیغِ دودم زندگی ہے
روانیِ تیغ آزماتا چلا جا

ولی کاکوری

۶ پیغامِ حیات

یہ خموشی بے محل ہے یہ سکوں ہے ناروا
دے پیامِ زندگی اے شاعرِ رنگیں نوا
آشنائے رازِ فطرت ہے دلِ روشن ترا
دہر کی آلائشوں سے پاک ہے دامن ترا

دل کے آئینے میں پیدا جوہرِ سیماب کر
آپ بھی بے تاب ہو اوروں کو بھی بے تاب کر
گلشنِ اُمید پیدا کر دلِ افسردہ میں
زندگی کی لہر دوڑا دے عروقِ مُردہ میں

اُٹھ سکونِ خواب کب تک اب نہیں اس کا محل
بے عمل ہیں جو جواں دے ان کو اب درسِ عمل
گلشنِ ہستی میں ہو ہنگامہ آرائے حیات
نغمۂ بلبل ہے سرگرم تقاضائے حیات

امتحاں گاہِ عمل یہ جہانِ بے بقا
عرصۂ پیکار ہے یہ خاکدانِ بے بقا

کوششِ پیہم میں ہے رازِ دوامِ زندگی
ہے یہی مئے درخورِ مینا و جامِ زندگی

یاس و حرماں رنج و غم ہیں قاطعِ نخلِ حیات
آرزو ہائے دمادم سے ہے زندہ کائنات

آرزو کی مے سے پرُ روشن زندگی کا جام ہے
ناامیدی درحقیقت موت کا پیغام ہے

بے قرارِ آرزو انسان کا گر دل نہیں
دہر میں پھر زندگی کا حق اُسے حاصل نہیں

کامرانی کا ذریعہ ہے جنونِ آرزو
پھونک دے کانوں میں سب کے افسونِ آرزو

ہاں لکھے جا اے وفیؔ نظمیں اسی انداز میں
سیکڑوں نغمے ہیں تیرے دل کے ٹوٹے ساز میں

جوشؔ ملیح آبادی

۷۔ گزر جا

مسرت کی تانیں اُڑاتا گزر جا — طرب کے ترانے سُناتا گزر جا
بشاشت کے دریا بہاتا گزر جا — زمانے سے گاتا بجاتا گزر جا
گزر جا، زمیں کو نچاتا گزر جا

مٹا ڈال، احساسِ آزارِ غم کو — جو دانا ہے تو پھینک دے بارِ غم کو
جلا دے فرامینِ سرکارِ غم کو — جری ہے تو ہر ایک دیوارِ غم کو
ہلاتا، جھٹکاتا، گراتا، گزر جا

زمان و مکاں کی ستم رانیوں پر — مصائب کی ہنگامہ سامانیوں پر
حیاتِ دوروزہ کی نادانیوں پر — خطا اور خطا کی پشیمانیوں پر
نظر ڈالتا، مسکراتا گزر جا

دغا کے گرجتے ہوئے بادلوں پر — وفا کے گرجتے ہوئے بادلوں پر
جفا کے گرجتے ہوئے بادلوں پر — بلا کے گرجتے ہوئے بادلوں پر
مسرت کا پرچم اُڑاتا گزر جا

یہ مانا کہ یہ زندگی، پُر الم ہے — یہ مانا کہ یہ زندگی موجِ سم ہے
یہ مانا کہ یہ زندگی، اک ستم ہے — یہ مانا کہ یہ زندگی، غم ہی غم ہے

سر غم پہ ٹھوکر لگاتا گزر جا

مسافر کو کب ہے سفر گھاٹیوں سے — جھجکتا ہے کیوں؟ آ گزر گھاٹیوں سے
نہ ڈر وادیوں سے نہ ڈر گھاٹیوں سے — زمانے کی پُر شور و شر گھاٹیوں سے
اگر مرد ہے، گنگناتا گزر جا

اگر ہر نفس ہے ستانے پہ مائل — اگر زندگی ہے، رُلانے پہ مائل
اگر آسماں ہے، مٹانے پہ مائل — اگر دہر ہے رنگ اُڑاتے پہ مائل
خود اس دہر کا رنگ اُڑاتا گزر جا

جہاں کی روش ہے بہت ظالمانہ — ریا، ہر فسوں ہے۔ دغا، ہر فسانہ
نہ کر پھر بھی یہ شکوۂ عامیانہ — کہ آنکھیں دکھاتا ہے مجھکو زمانہ
زمانے کو آنکھیں دکھاتا گزر جا

۲۔ طنز و ظرافت

اکبر الہ آبادی

۱۔ اشعار

اپنے بھائی کے مقابل کبر سے تن جائیے
غیر کا جب سامنا ہو بس قلی بن جائیے

فلسفہ الحاد کا کر لیجئے فوراً قبول
دین کی ہو بات تو ابطال پہ کٹ جائیے
چندے کی مجلس میں پڑھئے رو کے قرآن مجید
مذہبی محفل میں لیکن قتل دشمن جائیے
شیخ صاحب ہے یہی قومی ترقی کی شناخت
روٹھنے سے کچھ نہیں ہے فائدہ من جائیے

مذہب نے پکارا اے اکبر، اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں
یاروں نے کہا یہ قول غلط تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں
ہر بات پہ تم قسمیں کھانا جب یاد کریں راجہ صاحب
دربار اودھ میں اے اکبر واللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں
ملنے کا کسی سے ہے یہ مزا اک جوش طبیعت پیدا ہو
اس بزم میں میرے پہنچنے پہ اخاہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

اپنی گرہ سے کچھ نہ مجھے آپ دیجئے
اخبار میں تو نام مرا چھاپ دیجئے
دیکھو جسے وہ پائنیر آفس میں ہے ڈٹا
بہر خدا مجھے بھی کہیں چھاپ دیجئے

چشمِ جہاں سے حالتِ اصلی چھپی نہیں
اخبار میں جو چاہیے وہ چھاپ دیجئے
دعویٰ بہت بڑا ہے ریاضی میں آپ کو
طولِ شبِ فراق کو تو ناپ دیجئے
سنتے نہیں ہیں شیخ نئی روشنی کی بات
انجن کی ان کے کان میں اب بھاپ دیجئے

شو میکری شروع جو کی اک عزیز نے
جو سلسلہ ملاتے تھے بہرام گور سے
پوچھا کہ بھائی تم تو تھے تلوار کے دھنی
مورث تمھارے آئے تھے غزنین و غور سے
کہنے لگے ہے اس میں بھی اک بات نوک کی
ردّی ہم اب کماتے ہیں جوتے کے زور سے

راہ تو مجھ کو بتا دی خضر نے — اونٹ کا لیکن کرایہ کون دے
اب تو جاگو ایشیائی بھائیو — نیند میں غفلت کی صدیوں سو لئے
ہو مبارک جستجوئے خضر انھیں — ہم تو اب انجن کے پیچھے ہو لئے

اب تھیٹر میں ہنسیں گے جا کے خوب
خانقاہوں میں تو برسوں رو لئے

زندگی اور قیامت میں ریلیشن سمجھو　　اس کو کالج اور اسے کانووکیشن سمجھو
ہو جنہیں مقدرتِ وضع و نفاذِ قانون　　بس انھیں کو صفِ اقوام میں نیشن سمجھو
آہ و فریاد سے قابو میں نہ آئے گا وہ یار
طپشِ قلب کو بنگال ایجی ٹیشن سمجھو

مذہب کبھی سائنس کو سجدہ نہ کرے گا　　انسان اڑیں بھی تو خدا ہو نہیں سکتے
از راہِ تعلق کوئی جوڑا کرے رشتہ　　انگریز تو نیٹو کے چچا ہو نہیں سکتے
نیٹو نہیں ہو سکتے جو گورے ہیں تو ہے کیا غم　　گورے بھی تو بندے سے خدا ہو نہیں سکتے
ہم ہوں جو کلکٹر تو وہ ہو جائیں کمشنر
ہم ان سے کبھی عہدہ برا ہو نہیں سکتے

چھوڑ لٹریچر کو اپنی ہسٹری کو بھول جا
شیخ و مسجد سے تعلق ترک کر اسکول جا
چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ
کھا ڈبل روٹی، کلرکی کر، خوشی سے پھول جا

چھاپے کی تقویت پہ "لیڈر" ہو نہ اکبر — اپنی لبساط دیکھو، اپنا مقام دیکھو
ان کا مراتعلق ہے اس سے صاف ظاہر — اُن کا اشارہ دیکھو، میر اسلام دیکھو

اب نہ جنگی علم نہ جھنڈا ہے — صرف تعویذ اور گنڈا ہے
کیا ہے باقی جناب قبلہ میں — کچھ حدیثیں ہیں ایک ڈنڈا ہے
سو وہ ڈنڈا بھی اب ہے ضبط پولس
ہے زباں گرم قلب ٹھنڈا ہے

یہ بات تو کھری ہے ہرگز نہیں ہے کھوٹی
عربی میں نظم ملت "بی اے" میں صرف روٹی
لیکن جناب لیڈر سن کر یہ شعر بولے
بندھوائیں گے یہ حضرت اس قوم کو لنگوٹی
اس بات کو خدا ہی بس خوب جانتا ہے
کس کی نظر ہے غائر کس کی نظر ہے موٹی

خالی حرم کو شیخ ہی تنہا نہ کر گئے
حیرت میں بت بھی ہیں کہ برہمن کدھر گئے

سودائے مغربی سے ہیں سب کے حواس گم
ایسی یہ تپ چڑھی ہے کہ چہرے اُتر گئے
آیا وطن میں پھر کے مگر اس کی کیا خوشی
جن جن کو پوچھتا ہوں، یہ سنتا ہوں مر گئے

اسٹیشن فنا کی بھی کیا خوب ریل ہے
اس راہ میں ہر ایک پسینجر کا میل ہے
غفلت نے کر دیا جنھیں آزاد وہ ہنسیں
میری نگاہ میں تو یہ دنیا ہی جیل ہے

کیوں اپنے سر پہ زحمت بے سود لیجئے ۔ کونسل کے بدلے گھر میں اچھل کود لیجئے
کھاپی کے گھر میں بیٹھیے اور گائیے بھجن ۔ کاشی سے جل پراگ سے امرود لیجئے
ہو وضع اپنے دیس کی مال اپنے دیس کا
بہتر ہے راہِ منزلِ بہبود لیجئے

تعلیوں کو طبیعت رجکٹ کرتی ہے ۔ جو دل شکستہ ہیں اُن کو سلکٹ کرتی ہے
ملا ہوں خاک میں خود اس سبب سے میری نظر ۔ گرا کے قصر نگو نے ارکٹ کرتی ہے

اقبال

۲۔ ہمارا حال

ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا ہے
واں کنٹر سب بلوری ہیں یاں ایک پرانا مٹکا ہے
اس دور میں سب مٹ جائیں گے ہاں! باقی وہ رہ جائے گا
جو قائم اپنی راہ پہ ہے اور پکا اپنی ہٹ کا ہے
اے شیخ و برہمن! سنتے ہو کیا اہلِ بصیرت کہتے ہیں
گردوں نے کتنی بلندی سے ان قوموں کو دے پٹکا ہے
یا باہم پیار کے جلسے تھے، دستورِ محبت قائم تھا
یا بحث میں اُردو ہندی ہے، یا قربانی یا جھٹکا ہے

۳۔ اونٹ اور گائے

گائے اک روز ہوئی اونٹ سے یوں گرمِ سخن
نہیں اک حال پہ دنیا میں کسی شے کو قرار
میں تو بدنام ہوئی توڑ کے رسّی اپنی
سنتی ہوں آپ نے بھی توڑ کے رکھ دی ہے مہار

ہند میں آپ تو از روئے سیاست ہیں اہم
ریل چلنے سے مگر دشتِ عرب میں بے کار

کل تلک آپ کو تھا گائے کی محفل سے حذر
تھی لٹکتے ہوئے ہونٹوں پہ صدائے زنہار

آج یہ کیا ہے کہ ہم پر ہے عنایت اتنی
نہ رہا آئینۂ دل میں وہ دیرینہ غبار

جب یہ تقریر سُنی اونٹ نے شرما کے کہا
ہے ترے چاہنے والوں میں ہمارا بھی شمار

رشکِ صد غمزۂ اشتر ہے تری ایک کلیل
ہم تو ہیں ایسی کلیلوں کے پرانے بیمار

ترے ہنگاموں کی تاثیر یہ پھیلی بن میں
بے زبانوں میں بھی پیدا ہے مذاقِ گفتار

ایک ہی بن میں ہے مدت سے بسیرا اپنا
گرچہ کچھ پاس نہیں، چارہ بھی کھاتے ہیں اُدھار

گوسفند و شُتر و گاؤ و پلنگ و خرِ لنگ
ایک ہی رنگ میں رنگیں ہوں تو ہے اپنا وقار

باغباں ہو سبق آموز جو یک رنگی کا
ہم زباں ہو کے رہیں کیوں نہ طیورِ گلزار

دے وہی جام ہمیں بھی کہ مناسب ہے یہی
تو بھی سرشار ہوا تیرے رفقا بھی سرشار

۴۔ گفتار و کردار

مسجد تو بنا دی شب بھر میں، ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے، برسوں میں نمازی بن نہ سکا
کیا خوب امیرِ فیصل کو سنوسی نے پیغام دیا
تو نام و نسب کا حجازی ہے پر دل کا حجازی بن نہ سکا
تر آنکھیں تو ہو جاتی ہیں پر کیا لذت اس رونے میں
جب خونِ جگر کی آمیزش سے اشک پیازی بن نہ سکا
اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

۷۔ احساسات

اکبر الہ آبادی

ا۔ غزلیں

اور بھی دورِ فلک ہیں ابھی آنے والے
ناز اتنا نہ کریں ہم کو مٹانے والے

۷۰

سیکڑوں دورِ جنوں ہیں ابھی آنے والے
مطمئن کیا ہیں مجھے ہوش میں لانے والے

اُٹھتے جاتے ہیں اب اس بزم سے اربابِ نظر
گھٹتے جاتے ہیں مرے دل کے بڑھانے والے

خاتمہ عیش کا حسرت ہی پہ ہوتے دیکھا
رو ہی کے اُٹھے ہیں اس بزم میں گانے والے

حدِّ ادراک میں داخل نہ ہوا سرِّ ازل
کچھ سمجھ ہی نہ سکے ہوش میں آنے والے

موجِ معنی ہوئی گُم بندھ گئے الفاظ کے پُل
کچھ خبر ہے تجھے اے بات بنانے والے

آپ اندھیرے میں ہیں بجلی سے مدد لیتے ہیں
چاند سورج ہیں جنہیں راہ دکھانے والے

بارِ احسان جسے کہتے ہیں وہ ہے کوہِ جفا
کاش نادم ہوں یہ احسان جتانے والے

آپ منکر ہیں غلامی بھی نہیں ملتی ہے
سلطنت کر گئے عقبیٰ سے ڈرانے والے

قدمِ شوق سے بڑھے ان کی طرف کیا اکبر
دل سے ملتے نہیں یہ ہاتھ ملانے والے

(۲)

اللہ رے کامیابی اُس چشمِ پُرفسوں کی — عقلیں ہزار اُبھریں تابع رہیں جنوں کی
تنویر چاہتا ہے گر آتشِ دروں کی — ہو اس کا محو جس نے مٹی میں روح پھونکی
نشتر لگائے جا تو اے رنجِ ناامیدی — دل کو ابھی شکایت باقی ہے جوشِ خوں کی
آفاق پہ ہیں طاری آثار شامِ غم کے — اللہ دل کو قوت دے صبر کی سکوں کی
فطرت نے باغِ ہستی پیشِ نظر کیا ہے
دیکھو بہار اکبر اس روئے لالہ گوں کی

منتشر ذرّوں کو یکجائی کا جوش آیا تو کیا — چار دن کے واسطے مٹی کو ہوش آیا تو کیا
عارضی ہیں موسمِ گل کی یہ ساری مستیاں — لالۂ گلشن میں اگر ساغر بدوش آیا تو کیا
دورِ آخر بزمِ دنیا کا ہے جامِ خونِ دل — عیش اس محفل میں بن کر بادہ نوش آیا تو کیا
حلقۂ حیرت ہی میں رکھا ضعف نے ادراک کو
پیکرِ خاکی کو اس عالم میں ہوش آیا تو کیا

اگرچہ تلخ ملا جامِ عمرِ فانی کا — مگر محل نہیں ہے ساقی سے بدگمانی کا
میں آہ کر نہ سکا ضبط کی ہوئی تعریف — رہوں گا شکر گزار اپنی ناتوانی کا
لبیبِ روح کے خالق سے ہے سوالِ شوق — اگرچہ حق ہے اُسے نازِ "لن ترانی" کا
سوا خدا کے کسی کا خیال آ نہ سکا
غموں نے کام دیا دل کی پاسبانی کا

۲۔اقبال ۷۲

غزلیں

چمک تیری عیاں بجلی میں، آتش میں، شرارے میں
جھلک تیری ہویدا، چاند میں، سورج میں، تارے میں
بلندی آسمانوں میں زمینوں میں تری پستی
روانی بحر میں، افتادگی تیری کنارے میں
جو ہے بیدار انساں میں وہ گہری نیند سوتا ہے
شجر میں، پھول میں، حیواں میں، پتھر میں، ستارے میں
مجھے پھونکا ہے سوزِ قطرۂ اشکِ محبت نے
غضب کی آگ تھی پانی کے چھوٹے سے شرارے میں
نہیں جنسِ ثوابِ آخرت کی آرزو مجھ کو
وہ سوداگر ہوں میں نے نفع دیکھا ہے خسارے میں
سکوں نا آشنا رہنا اسے سامانِ ہستی ہے
تڑپ کس دل کی یارب چھپ کے آ بیٹھی ہے پارے میں
صدائے لن ترانی سن کے اے اقبالؔ میں چپ ہوں
تقاضوں کی کہاں طاقت ہے مجھ فرقت کے مارے میں

(۲)

پھر بادِ بہار آئی، اقبال غزل خواں ہو
غنچہ ہے اگر گل ہو، گل ہے تو گلستاں ہو

تو خاک کی مٹھی ہے، اجزا کی حرارت سے
برہم ہو، پریشاں ہو، وسعت میں بیاباں ہو

تو جنس محبت ہے، قیمت ہے گراں تیری
کم مایہ ہیں سوداگر، اس دیس میں ارزاں ہو

کیوں ساز کے پردے میں مستور ہو لے تیری؟
تو نغمۂ رنگیں ہے، ہر گوش پہ عریاں ہو

اے رہروِ فرزانہ! رستے میں اگر تیرے
گلشن ہے تو شبنم ہو، صحرا ہے تو طوفاں ہو

ساماں کی محبت میں مضمر ہے تن آسانی
مقصد ہے اگر منزل، غارت گرِ ساماں ہو

کبھی اے حقیقتِ منتظر! نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں
طرب آشنائے خروش ہو، تو نوا ہے محرمِ گوش ہو
وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوتِ پردۂ ساز میں

تو بچا بچا کے نہ رکھ اِسے، ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

دمِ طوف کرمکِ شمع نے یہ کہا کہ "وہ اثرِ کہن"
نہ تری حکایتِ سوز میں، نہ مری حدیثِ گداز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

۳۔ فانی بدایونی

غزلیں

بوئے خزاں سے مست ہیں یادِ بہار کیا
ہم تو چمن پرست ہیں پھول کہاں کے خار کیا

محوِ فریبِ ذات ہوں بے خبرِ صفات ہوں
کوئی ہوا تو شمعِ بزم کیا، شمعِ سرِ مزار کیا

ہوش سے احتراز کر، فانی نہ غم کا راز کہہ
دغدغۂ حساب کیوں، شکوۂ روزگار کیا

حد سے سوا جفا سہی مجھ پہ ہے خیر ہی نہیں
جوششِ سیلِ گریہ کون ضبط کو ناگوار کیا

جو غم بے اثر نہ ہوا، جو شب بے سحر نہ ہو — وہ غمِ انتظار کیا، وہ شبِ انتظار کیا
اپنے کمالِ شوق پر حشر کا دل ہے منحصر — وعدۂ دید چاہیئے زحمتِ انتظار کیا
کھیل تھا سب امید کا یہ نہ رہی تو کچھ نہ تھا — آرزوؤں کی کیا بساط شوق کا کاروبار کیا
فانیؔ اب اپنی زندگی حسنِ عتابِ یار ہے
دیکھیئے مرگِ ناگہاں لائے پیامِ یار کیا

(۲)

ناکام ہے تو کیا ہے کچھ کام پھر بھی کر جا — مردانہ وار جی اور مردانہ وار مر جا
دنیا کے رنج و راحت کچھ ہوں تری بلا سے — دنیا کی ہر ادا سے منہ پھیر کر گزر جا
اس بحرِ بیکراں میں ساحل کی جستجو کیا — کشتی کی آرزو کیا، ڈوب اور پار کر جا
یہ دعوائے خبر ہی عصیاں بھی ہے سزا بھی — بے ہوش و بے خبر رہ بے خوف بے خطر جا
گھبرا گیا خرد کی تاریکیوں سے فانیؔ
اے نورِ عشق دل کی گہرائیوں میں بھر جا

(۳)

گزرے گی اب نہ غم کا مداوا کیئے بغیر — ہٹتی نہیں اجل سے تقاضا کیئے بغیر
دل کامیابِ شوق ہے بے منتِ نگاہ — جلوے ہیں دلفریب تماشا کیئے بغیر
اللہ رے اعتمادِ محبت کہ آج تک — ہر درد کی دوا ہیں وہ اچھا کیئے بغیر
وہ جان ہی نہیں جو نہ ہو جائے نذرِ دوست — دل ہی نہیں ہے اس کی تمنا کیئے بغیر
ممکن نہیں ہے راحتِ دنیا کی آرزو — غم بیگمانِ راحتِ دنیا کیئے بغیر

لازم سی ہے حیات کہ فانی مفر نہیں
جینے کی تلخیوں کو گوارا کئے بغیر

(۴)

۹۱ دل وقفِ تپش سے ہائے مگر وجہِ تپش دل کوئی نہیں
بسمل ہوں مگر کیوں بسمل ہوں فریاد کہ قاتل کوئی نہیں

۹۲ کس زعم میں ہے اے رہروِ غم دھوکے میں نہ آنا منزل کے
یہ راہ بہت کچھ چھانی ہے، اس راہ میں منزل کوئی نہیں

۹۳ بس آن پہ نہ اُن کی یاد پہ ہے، تقدیر کے کیا کیا پہلو ہیں
تدبیر سے حاصل کچھ بھی نہیں تدبیر سے غافل کوئی نہیں

۹۴ دریائے محبت بے ساحل اور ساحل بے دریا بھی ہے
جو موج ڈبو دے ساحل ہے یوں نام کا ساحل کوئی نہیں

۹۵ کر شیشہ و ساغر بادہ و ساقی گل اور شمع سے قطع نظر
محفل میں یہ رونق کس کی ہے جب صاحبِ محفل کوئی نہیں

۹۶ فانی ہی وہ اک دیوانہ تھا، جو موت سے پہلے مرجائے
کیا ہوش کی کافر دنیا میں اس موت کے قابل کوئی نہیں

(۵)

قطرہ دریائے آشنائی ہے — کیا تری شان کبریائی ہے
وہم کو بھی ترا نشاں نہ ملا — نارسائی سی نارسائی ہے

کون دل ہے جو درد مند نہیں — کیا ترے درد کی خدائی ہے
جلوۂ یار کا بھکاری ہوں — شش جہت کاسۂ گدائی ہے
ترکِ اُمید بس کی بات نہیں — ورنہ اُمید کب بر آئی ہے
آرزو پھر ہے درپئے تدبیر — سعیِ ناکام کی دہائی ہے
موت ہی ساتھ دے تو دے فانیؔ
عمر کو عذرِ بے وفائی ہے

(۶)

بشر میں عکس موجوداتِ عالم کا ہم نے دیکھا ہے
وہ دریا ہے یہ قطرہ لیکن اس قطرے میں دریا ہے
مری آنکھوں میں آنسو تجھ سے ہمدم کیا کہوں کیا ہے
ٹھہر جائے تو انگارہ ہے بہہ جائے تو دریا ہے
مری محرومیوں کا فیض جاری ہے رگ و پے میں
بدن میں جو لہو کی بوند ہے خونِ تمنا ہے
گوارا ہے ظلم، طعنے غیر کے، لوگوں کے آوازے
محبت میں دلِ مجبور کو سب کچھ گوارا ہے
یہ کیا کہتے ہو فانیؔ سے کہ تیری موت آئی ہے
تم اس ناکام کے دل سے تو پوچھو زندگی کیا ہے

حسرت موہانی

غزلیں (۱)

برکتیں سب ہیں عیاں دولتِ روحانی کی
واہ کیا بات ہے اس چہرۂ نورانی کی

شوق دیکھے تجھے کس آنکھ سے اے مہر جمال
کچھ نہایت ہی نہیں تیری درخشانی کی

جب سنا یاد کیا کرتے ہو تم کبھی تو مجھے
کیا کہوں حد نہ رہی کچھ مری حیرانی کی

سعیِ احباب کو ناحق ہے رہائی کا خیال
اور ہی کچھ ہے تمنا ترے زندانی کی

رشکِ شاہی ہو نہ کیوں اپنی فقیری حسرتؔ
کب سے کرتے ہیں غلامی شہِ جیلانی کی

(۲)

مجھ کو خبر نہیں کہ مرا مرتبہ ہے کیا
یہ تیرے التفات نے آخر کیا ہے کیا

میری خطا پہ آپ کو لازم نہیں نظر
یہ دیکھئے مناسبِ شانِ عطا ہے کیا

دیکھو جسے ہے راہِ فنا کی طرف رواں
تیری محل سرا کا یہی راستا ہے کیا

ہم کیا کریں نہ تیری اگر آرزو کریں
دنیا میں اور بھی کوئی تیرے سوا ہے کیا

رونے لگے ابھی سے کہ ہے ابتدائے حال
تم نے ابھی فسانۂ حسرتؔ سنا ہے کیا

(۳)

تجھ سے ہے حسن و جمالِ دو جہاں کی رونق
اے تری یاد مرے خانۂ جاں کی رونق

جاگزیں جب سے ہوئی تیری محبت دل میں
بڑھ گئی اور بھی اس جنس گراں کی رونق

کیا نہیں شوقِ شہادت کو یہ کافی اعزاز
کہ مرا سر ہے ترے نوکِ سناں کی رونق

یاد میں اُس گلِ رعنا کے جو نکلے آنسو
بن گئے دیدۂ خونابہ فشاں کی رونق

شعر سے تیرے ہوئی مصحفیؔ و میرؔ کے بعد
تازہ حسرتؔ اثر و حسنِ بیاں کی رونق

(۴)

ہم پر بھی مثلِ غیر ہیں کیوں مہربانیاں
اے بدگمان یہ خوب نہیں بدگمانیاں

طاعت گزار ہوں دلِ حسرت پسند کا
ناکامیاں ہیں میرے لئے کامرانیاں

رنگِ بہارِ باغ ہے مہمان یک نفس
اے وائے عندلیب تری شادمانیاں

ٹھہرا ہے ضبطِ شوق پہ آکر معاملہ
اس درجہ آرزو کی بڑھیں بے نیازیاں

حسرت تری شگفتہ کلامی پہ آفریں
یاد آگئیں نسیم کی رنگیں بیانیاں

(۵)

آنکھوں کو انتظار سے گردیدہ کر چلے
تم تو یہ خوب کارِ پسندیدہ کر چلے

اظہارِ التفات کے پردے میں اور بھی
وہ عقدہ ہائے شوق کو پیچیدہ کر چلے

ہم بیخودوں سے چھپ نہ سکا رازِ آرزو
سب ان سے عرضِ حالِ دل و دیدہ کر چلے

تسکینِ اضطراب کو آئے تھے وہ مگر
بے تابیوں کی روح کو بالیدہ کر چلے
یہ طرفہ ماجرا ہے کہ حسرت سے مل کے وہ
کچھ جان و دل کو اور بھی شوریدہ کر چلے

(۶)

نہ ہو اُس کی خطا پوشی پہ کیوں نازِ گنہگاری
یہ نشانِ شانِ رحمت بن گیا داغِ سیہ کاری
وفا سے دشمنی رکھ کر، مرے دل کی طلبگاری
بہت مشکل ہے اس جنسِ گرامی کی خریداری
وفورِ اشکِ پیہم سے، ہجومِ شوق بیحد ہیں
مری آنکھوں سے ہے ہر اک آبشارِ آرزو جاری
خوشی سے ختم کرلیں سختیاں قیدِ فرنگ اپنی
کہ ہم آزاد ہیں بیگانۂ رنجِ دل آزاری
وہ مجرم آرزو پر جس قدر چاہیں سزا دے لیں
مجھے خود خواہشِ تعزیر ہے ملزم ہوں اقراری
نسیم دہلوی کو وجد ہے فردوس میں حسرت
جزاک اللہ تیری شاعری ہے یا فسوں کاری

۸۔ نکات

اکبر الہ آبادی

رباعیاں

ہر چند محل انقلابات رہا گھٹنے بڑھنے کا بیچ دن رات رہا
چھوڑیں نہیں منزلیں قمر نے اپنی ذی رتبہ و صاحب مقامات رہا

فرمان اجل کا آگیا وقت صدور ہوں گے کوئی دم میں شامل اہل قبور
دیکھیں منکر نکیر کیا کہتے ہیں یاں سب مجھے کہتے ہیں خداوند حضور

دلکش نہیں وہ حسین جسے شرم نہیں
رونق نہیں اس کی جس کا دل گرم نہیں
سختی میں بھی ہو گداز طینت ہو جو صاف
پگھلی ہے برف گو کہ وہ نرم نہیں

سمجھے جو کوئی برا یہ مضمون نہیں کوئی پہلو خلاف قانون نہیں
ہر چند کہ یہ مزے چکھاتا ہے بہت شیطان کا کوئی شخص ممنون نہیں

اعمال کے حسن سے سنورنا سیکھو اللہ سے نیک امید کرنا سیکھو
مرنے سے مفر نہیں ہے جب اے اکبر بہتر ہے یہی خوشی سے مرنا سیکھو

راحت کا سماں بندھا تو غفلت بھی ہوئی
حسرت کا کھنچا جو سین عبرت بھی ہوئی
دنیا میں جسے جو پیش آیا اکبر
بس اس کے مطابق اس کی حالت بھی ہوئی

خلقت جو کہیں ذلیل ہو جاتی ہے بے غیرت و بے دلیل ہو جاتی ہے
گو جسم میں ظاہرا توانائی ہو اخلاق میں وہ علیل ہو جاتی ہے

اوہام کے ہاتھ سے نہ ایذا سہیئے بندوں کے نہیں خدا کے ہو کر رہیئے
ہے پیش نگاہ جلوۂ ارض و سما سبحان اللہ جوشِ دل سے کہیئے

۲- اثرِ صہبائی

رباعیاں

نیرنگ طلسم زندگی کو پایا آلودۂ غم ہر اک خوشی کو پایا
تسکین ہے اگر تو ذکرِ یزداں میں اثر سرچشمۂ بے خودی اسی کو پایا

ناکامیِ زندگانی سے ڈرنا کیسا! ہنگامِ شکست آہ بھرنا کیسا!
زندہ ہے اگر تو ننگِ ہستی کیوں ہے! یہ موت سے پیشتر ہی مرنا کیسا!

ہر لطف کے پردے میں ستم پایا ہے
ہر سازِ طرب میں سوزِ غم پایا ہے
مے خانۂ دہر میں مئے ناب کہاں!
ہر جام کو آلودۂ سم پایا ہے

یہ وقت نہیں ہے سرد آہوں کے لئے
کیوں وقف ہو کوئی خانقاہوں کے لئے
ہنگامِ سحر ہیں جلوہ ہائے ازلی
نظارے عجیب ہیں نگاہوں کے لئے

صہبائے نشاط کی تمنا نہ کرے جو تلخیِ زہرِ غم گوارا نہ کرے
غم جزوِ حیات ہے طلبگارِ حیات نیشِ غمِ زندگی کی پروا نہ کرے

زہرِ غمِ آرزو پئے جاتا ہوں پھر بھی مگر آرزو کئے جاتا ہوں
دیکھا ہے ہزار بار انجامِ امید امید پہ پھر بھی جاں دئے جاتا ہوں

جب ہمت اہلِ دل سنبھل جاتی ہے   تقدیر سے تدبیر کی چل جاتی ہے
گر صدقِ طلب ہو اور شمشیرِ عمل   تقدیر بھی اے دوست بدل جاتی ہے

گلہائے بہار بھی گذر جائیں گے   خاشاک بھی خار بھی گذر جائیں گے
اے دوست ہے کس لئے پریشان و ملول!   یہ لیل و نہار بھی گذر جائیں گے

ہنگامۂ شوکتِ شہی سے نہ ڈرو   بزمِ جم و شانِ قیصری سے نہ ڈرو
یوں عمر بسر ہو اس صنم خانے میں   سب تم سے ڈریں پہ تم کسی سے نہ ڈرو

ہم حق کے لئے ہیں خون بہانے والے!   ہم اپنے ہی خوں میں ہیں نہانے والے!
ہم موت و حیات سے ہیں بالا اے دوست!   ہم پرچمِ حق کے ہیں اُٹھانے والے!

جوش ملیح آبادی

رباعیاں

دُنیا ہے فقط رنج بڑھانے کے لئے
کمبخت بٹھاتی ہے اُٹھانے کے لئے
لازم ہے کہ روؤں بھی تو ہنسنے کی طرح
جب چرخ ہنساتا ہے رُلانے کے لئے

پھولوں کی اگر ہوس ہے خاروں کو نہ دیکھ
عشرت کی ہے دُھن تو سوگواروں کو نہ دیکھ
تعمیر حیات ہے اگر پیشِ نظر
مُڑ کر کبھی مٹے ہوئے مزاروں کو نہ دیکھ

رقصاں ہو جو باطن میں جوانی ہے وہی
پیدا ہو جو خود سے کامرانی ہے وہی
چشمے کی طرح دل سے جو تیرے پھوٹے
اے یارِ عزیز! شادمانی ہے وہی

احقر نہیں کوئی ناتواں سے بڑھ کر
ابتر نہیں کوئی ناتواں سے بڑھ کر
از روئے شریعتِ خدائے کم و بیش
کافر نہیں کوئی ناتواں سے بڑھ کر

افسوس کوئی واقفِ منزل نہ ہوا
ناقص ہی رہا ہمیشہ کامل نہ ہوا
ناداں پیدا ہوا تھا ناداں ہی مرا
انساں کو کبھی بلوغ حاصل نہ ہوا

افسوس کہ کوئی کام ہوتا ہی نہیں   جی بھر کے یہاں قیام ہوتا ہی نہیں
سننے والے تمام ہو جاتے ہیں   افسانہ مگر تمام ہوتا ہی نہیں

اک پل مرنا ہے اور اک پل جینا
مرنا بے چین ، اور بے کل جینا
اک سانس میں زندگی ہے اک سانس میں موت
ممکن نہ ہوا کبھی مسلسل جینا

متفرقات

جب رخصتِ شباب پارا پارا ہوگا
دل کو رونے کا کبھی نہ یارا ہوگا
حیراں ہوں کہ داغِ شیب و ننگِ پیری
کیوں کر مری غیرت کو گوارا ہوگا

کھٹکے ہوئے انسان کو دیکھو تو ذرا
اس عقل کے نادان کو دیکھو تو ذرا
کس طرح اکڑ اکڑ کے رکھتا ہے قدم
دو پاؤں کے حیوان کو دیکھو تو ذرا

ارمان ہیں جس دل میں، وہ آباد نہیں
شادی کی جسے ہوس ہے، وہ شاد نہیں
ہر بندِ گراں کو توڑنے کے باوصف
اپنا جو غلام ہے، وہ آزاد نہیں

۴۔ زوال

رُباعیاں

رہبر بھی راہبر کبھی ہوتے جانا
دمساز کبھی نوحہ گر کبھی ہوتے جانا
آتی ہے یہ مرقدِ غریباں سے صدا
جانے والے اِدھر بھی ہوتے جانا

خنداں با چشمِ خونچکاں جاتے ہیں
لب تشنہ و روبسزباں جاتے ہیں
منزل پہ پہنچ کے بھی نہیں تھمتے پاؤں
کوئی بتلائے ہم کہاں جاتے ہیں

ہے اِتنی غرض دہر کے افسانے کی
جو کچھ کر، صاف کر، بدی یا نیکی
ہشیار کہ زندگی دو روزہ ہے رواں
نکلی ہوئی جان پھر نہیں آنے کی

یہ کیا کہ حیاتِ جاودانی کیا ہے
پہلے دیکھو جہانِ فانی کیا ہے
اس فکر میں ہو کہ موت کیا شے ہے رواں
یہ بھی سمجھے کہ زندگانی کیا ہے

افلاس اچھا نہ فکرِ دولت اچھی — جو دل کو پسند ہو وہ حالت اچھی
جس سے اصلاحِ نفس ناممکن ہو — اُس عیش سے ہر طرح مصیبت اچھی

دنیا سو سو طرح سے بہلاتی ہے
سامانِ خوشی سے روح گھبراتی ہے
اب فکرِ فنا نے کھول دی ہیں آنکھیں
کلفت ہر بات میں نظر آتی ہے

آزاد ضمیر ہے فقیری یہ ہے دل بے پروا رہے امیری یہ ہے
زنجیر نہیں ہے باعث قید روان محدود رہے خیال اسیری یہ ہے

کیا تم سے بتائیں عمر فانی کیا تھی
بچپن کیا چیز تھا جوانی کیا تھی
یہ گل کی مہک تھی وہ ہوا کا جھونکا
اک موج فنا تھی زندگانی کیا تھی

اُف باغ اُمید کے نمو کی تاثیر
پتی پتی کے رنگ و بو کی تاثیر
کانٹوں میں دل کشی ہے پھولوں کی سی
اللہ رے فریب آرزو کی تاثیر

کردار سے اپنے اشک بار آیا ہوں
اعمال سے اپنے شرمسار آیا ہوں
اے بخشنے والے سب گنہگاروں کے
مایوس نہ کر اُمیدوار آیا ہوں

سوانح عمریاں

۱۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال

محمد اقبال نام۔ اقبال تخلص۔ سر خطاب۔ سنہ ۱۸۷۰ء میں بمقام
سیالکوٹ پیدا ہوئے۔ وطن مالوف سیالکوٹ ہی ہے۔ گورنمنٹ کالج
لاہور سے ایم' اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد ولایت چلے
گئے۔ وہاں سے بیرسٹر اور فلسفہ کے ڈاکٹر ہو کر آئے۔ ابتدا سے
طبیعت شاعری کی طرف مائل تھی۔ بسنہ ۱۸۹۹ء میں آپ نے ایک نظم
"نالۂ یتیم" انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ اجلاس میں پڑھی۔ یہ نظم
بہت مقبول ہوئی۔ اقبال کا شمار جدید طرز کے بہترین شاعروں میں ہے۔
آپ فارسی کے بھی بلند پایہ کے شاعر ہیں۔ اخلاقی، قومی، وطنی جذبات
سے آپ کی نظمیں پُر ہوتی ہیں۔ آپ کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت
یہ ہے کہ آپ شاعرانہ لطافت کے ساتھ فلسفیانہ مضامین ادا کرتے ہیں۔
آپ کے اردو کلام کے مجموعے "بانگِ درا" "بالِ جبریل" اور
"ضربِ کلیم" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ سنہ ۱۹۳۸ء میں آپ نے انتقال کیا۔

۲۔ اکبر الہ آبادی

سید اکبر حسین رضوی نام۔ اکبر تخلص الہ آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ اپنی خداداد قابلیت کی وجہ سے چھوٹی ملازمت سے ترقی پاتے ہوئے سب ججی کے عہدے پر مامور ہوئے سرکار سے "خان بہادر" کا خطاب ملا۔ آپ موجودہ عہد کے ان ممتاز شعرائے اردو میں سمجھے جاتے ہیں جنھوں نے زمانہ کے عام میلان اور جدید اثرات سے متاثر ہو کر شاعری کے لئے نئی راہیں نکالیں۔ آپ کے کلام میں سنجیدگی ظرافت کی ایسی آمیزش ہے جو آپ کے ہمعصروں میں آپ کو ممتاز کرتی ہے۔ دقیق مسائل کو نہایت دلچسپ اور ظریفانہ پیرایہ میں نظم کرتے ہیں۔ اردو میں انگریزی الفاظ نہایت عمدگی سے کھپاتے ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں آپ کا انتقال ہو گیا۔

۳۔ سرور جہان آبادی

درگا سہائے نام۔ سرور تخلص، قصبہ جہان آباد ضلع پیلی بھیت کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۰ء میں انتقال ہو گیا۔ سرور کی شاعری زیادہ تر نیچرل ہے۔ مشرقی خیالات و جذبات کی رنگینیوں نے اس کو اور بھی دلکش بنا دیا ہے۔

۴۔ مولوی وحید الدین سلیم۔ پانی پتی

سیّد وحید الدین نام تھا۔ سلیم تخلص۔ یہ پانی پت کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی تعلیم مکان ہی پر حاصل کی۔ پھر لاہور آئے اور ادب عربی کی تکمیل کی۔ معقول و منقول اس زمانے کے مشہور مولوی عبداللہ ٹونکی سے پڑھا۔ انگریزی میں انٹرنس تک تعلیم حاصل کی اور فارسی میں منشی فاضل کا امتحان پاس کر لیا اور ریاست بہاول پور میں سررشتۂ تعلیم میں ملازمت کر لی۔ پھر رام پور ہائی اسکول میں ہیڈ مولوی کی حیثیت سے کام انجام دیا۔ اس کے بعد وطن چلے آئے اور مطب شروع کر دیا۔ آپ کی خداداد قابلیت اور ذہانت کا شہرہ ہو گیا۔ چنانچہ مولانا حالی کی وساطت سے سرسیّد احمد خاں سے ملاقات ہو گئی۔ سیّد صاحب نے آپ میں جوہر قابلیت دیکھ کر اپنا پرائیویٹ سکریٹری مقرر کیا۔ سرسیّد کے انتقال کے بعد آپ نے کئی اخباروں کی اڈیٹری کی۔ آپ کی شہرت کا حال سن کر حیدر آباد میں بلایا گیا۔ چنانچہ دارالترجمہ میں ایک ممتاز جگہ آپ کو مل گئی۔ پھر جامعہ عثمانیہ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ آپ کے نثر کے بہت سے مضامین ہیں اور نظمیں بھی آپ نے لکھی ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں آپ کا انتقال ہوا۔

نظم و نثر دونوں میں آپ کو قدرت حاصل تھی۔ اعلیٰ درجہ کے شاعر اور نثار تھے۔

۵۔ مسلم عظیم آبادی

محمد مسلم نام مسلم تخلص۔ آپ کی سکونت صادق پور عظیم آباد کا ایک مردم خیز و مشہور محلہ ہے۔ یہاں آپ ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم آپ نے صادق پور کے مدرسے میں حاصل کی جو اُس وقت بذات خود ایک جامعہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ فارسی و عربی علوم کی تحصیل سے فارغ ہو کر آپ نے انگریزی کی طرف توجہ کی اور اینگلو عربک اسکول پٹنہ سٹی، بی۔ این کالج پٹنہ، پریسیڈنسی کالج کلکتہ مختلف درس گاہوں میں تعلیم پائی۔ پھر آپ نے اورنٹیل کالج لاہور سے ایم۔ اے، ایم۔ او۔ ایل اور فاضل کے سندات حاصل کئے، اس وقت آپ سینٹ کولمباز کالج ہزاری باغ (بہار) میں فارسی و اردو کے پروفیسر ہیں۔

مسلم صاحب اردو کے ایک کہنہ مشق ادیب ہیں۔ آپ کے ادبی و تنقیدی مضامین مخزن لاہور، الناظر لکھنؤ، جامعہ دہلی، ساقی دہلی وغیرہ میں شائع ہوئے اور ہوتے رہتے ہیں۔ شاعری کا ابتدا ہی سے ذوق رہا اور اس سلسلے میں آپ نے شاد عظیم آبادی سے اصلاحیں لی ہیں۔ آپ نیچرل شاعری کے حامی ہیں۔ تغزل کو آپ کو پسند نہیں ہے۔ آپ کو افسانہ نگاری کا بھی شوق ہے۔ آپ کی تصانیف میں سے معتقدات عجم، فارسی علوم اور اسلام اور انڈو ایرین فائیلالوجی بہت مشہور ہیں۔

۶۔ جمیل مظہری

آپ کا نام کاظم علی ہے۔ ادبی دُنیا میں جمیل مظہری کے نام سے معروف ہیں، صوبہ بہار کے سارن ضلع میں حسن پورہ ایک قصبہ ہے، وہیں ۱۹۰۵ء میں آپ کی ولادت ہوئی۔ آپ نے ابتدا سے ایکز ایم۔ اے تک اپنی تعلیم کلکتہ میں مکمل کی۔ تحصیل علم سے فارغ ہوکر آپ نے اُردو صحافت کی طرف توجہ مبذول کی اور عرصہ تک آپ کلکتہ کے مختلف موقر اخباروں کی اڈیٹری کے فرائض انجام دیتے رہے ۱۹۳۷ء میں جب بہار میں کانگریسی وزارت قائم ہوئی تو آپ کی صلاحیتوں کا لحاظ کرتے ہوئے حکومت نے آپ کو اُردو پبلسٹی آفیسر مقرر کیا جس کے فرائض آپ بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں۔

جمیل صاحب کو ادبی ذوق قطرت کی طرف سے عطا ہوا ہے اور شاعری کے میدان میں بھی آپ نوجوان شعرا میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ آپ کا شمار ترقی پسند ادیبوں میں ہے اور آپ کا مقصد اُردو ادبیات کو رومانوی عنصر سے پاک کرکے زندگی کے قریب ترلانا ہے۔ شاعری کو آپ ترقی پسند خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اسی نصب العین کی ترویج کے لیئے آپ نے ۱۹۳۶ء میں اپنی سعی اور اہتمام سے

آل انڈیا اُردو لٹریری کانفرنس منعقد کی تھی اور اس کی مجلس استقبالیہ کا صدر آپ ہی کو بنایا گیا تھا۔

۷۔ اثرؔ صہبائی

آپ کا اصلی نام خواجہ عبدالسمیع ہے اور اثرؔ تخلّص۔ آپ کشمیری فرقہ پال کے معزز رکن ہیں۔ آپ کی پیدائش ۲۸ دسمبر ۱۹۰۱ء کو سیالکوٹ میں ہوئی۔ آپ کا خاندان علم دینی و دُنیوی سے خاص شغف رکھتا ہے۔ آپ نے ایم۔ اے تک تعلیم پائی ہے اور وکالت کا امتحان بھی پاس کیا ہے۔ آج کل سری نگر کشمیر میں ایک معزز عہدے پر مامور ہیں۔

شاعری کا آپ کو ابتدا سے شوق رہا ہے اور سِن کی پختگی کے ساتھ کلام میں بھی پختگی پیدا ہوگئی ہے۔ شاعری کے تمام اصنافِ سخن میں رُباعی لکھنے میں آپ کو خاص مہارت ہے۔ چنانچہ اس حیثیت سے آپ کو اُردو کا "عمر خیام" کہا جا سکتا ہے۔ ان کے کلام کے تین مجموعے نکل چکے ہیں ــــ "جامِ صہبائی" ــــ خمستان۔ اور "جامِ طہور"۔

۸۔ تلوک چند محروم

تلوک چند نام۔ محروم تخلص۔ عیسیٰ خیل ملک پنجاب وطن ہے۔ ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے۔

آپ کے کلام میں ادبی، اخلاقی اور قدرتی مناظر کی نظموں کا ذخیرہ کافی موجود ہے۔ غم واندوہ کے جذبات بڑی خوبی سے نظم کرتے ہیں۔ آپ کا کلام زبان کی صفائی، سلاست اور طرز بیان کی سنجیدگی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ روانی اور برجستگی کلام میں نمایاں ہے۔ غرض اردو داں طبقہ میں آپ کی نظمیں نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔

۹۔ بیدل عظیم آبادی

آپ کا نام عبدالمنان ہے اور بیدل تخلص، آپ کا وطن پٹنہ کے قرب دجوار میں ایک بستی ڈیاانواں ہے۔ آپ کی پیدائش ۱۸۹۴ء میں ہوئی۔ فارسی اور اردو کی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد آپ نے پٹنہ کالیجیٹ اسکول اور پٹنہ کالج میں انگریزی پڑھی اور ۱۹۱۷ء میں ایم۔ اے پاس کیا، تحصیل علم سے فارغ ہوکر کچھ دنوں تک آپ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں مدرس رہے پھر ۱۹۱۹ء میں آپ نیو کالج پٹنہ میں فارسی و اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے اور جب ۱۹۲۷ء میں نیو کالج پٹنہ کالج میں

منتقل ہو گیا تو ساتھ ساتھ آپ بھی پٹنہ کالج آگئے اور اب اس وقت آپ شعبۂ فارسی کے صدر ہیں۔

آپ کو تقریباً ۴۰ سال سے شعر و شاعری کا ذوق ہے لہذا آپ کی شاعری میں ایک کہنہ مشق استاد کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ بقول پروفیسر اختر اورینوی (ملاحظہ ہو نگار بابت اگست ۱۹۳۹ء) آپ کی شاعری کی بنا تجربہ اور تخییل پر ہے۔ آپ کے کلام میں درد، سوز، سرور و نشاط کی دلکش آمیزش ہے۔ اکثر جگہ متین شوخی اور لطیف مزاح کی چاشنی بھی موجود ہے، پیرایۂ بیان میں ندرت و جدّت اور زبان میں شادابی و شگفتگی ہے۔

حضرت بیدل اُن مایۂ ناز ہستیوں میں سے ہیں جنھوں نے عصرِ حاضر میں صوبۂ بہار میں اُردو ادب خصوصاً اُردو شاعری کی آبیاری کی اور یہاں اس کا صحیح مذاق قائم رکھا۔ اب سے چند سال پہلے آپ نے نوجوان شعراء کا ایک حلقہ قائم کیا تھا اور اپنی زیرِ نگرانی اُن کے ذوق ادب کی صحیح رہنمائی کی۔ چنانچہ موجودہ دور کے بہت سے نوجوان شعراء بیدل صاحب سے متاثر ہیں۔

آپ کی تالیفات میں سے اشعارِ ذوق، اشعارِ میر، اشعارِ مومن، نظمِ جدید یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہیں۔

———— : ✱ : ————

۱۰۔ شمس منیری

آپ کا نام حافظ شمس الدین احمد ہے اور شمس تخلص، وطن منیر شریف ضلع پٹنہ ہے۔ جہاں آپ سنہ ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مرحوم ریاست گوالیار میں مدتوں تک بہ سلسلۂ ملازمت سکونت پذیر رہے۔ وہیں آپ نے ابتدائی تعلیم و تربیت پائی اور اردو زبان اور محاوروں پر خاص عبور حاصل کیا۔ بی۔ اے بھی وہیں سے پاس کیا۔ پھر بہار آئے اور پٹنہ کالج سے ایم۔ اے اور بی۔ ایل کی ڈگری حاصل کی۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں آپ جی۔ بی۔ بی کالج مظفر پور میں فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ پھر سنہ ۱۹۲۴ء میں راونشا کالج کٹک (اڑیسہ) میں قانون کے پروفیسر ہوئے۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۲۷ء میں پٹنہ کالج میں فارسی و اردو کے پروفیسر مقرر ہو کر آئے اور اس وقت پٹنہ کالج اور پٹنہ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر ہیں۔

آپ ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ آپ کو شاعری سے فطری لگاؤ ہے یہی وجہ ہے کہ آپ نے اس فن میں کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی۔ اردو ادبیات کے علاوہ انگریزی ادبیات سے بھی کافی ذوق ہے۔ آپ کے تبحر علمی اور کمال شاعری کا ہر شخص معترف ہے۔ نظم نویسی سے زیادہ غزل گوئی کی طرف طبیعت مائل ہے۔ کلام سلیس اور با محاورہ ہوتا

ہے۔ تخئیل کا اعتدال، اچھوتاپن، اور رنگینی، طرز بیان کی سادگی اور زور، ہلکی شوخی اور لطیف اشارے، زبان کی صفائی اور روانی آپ کے کلام کی امتیازی خصوصیات ہیں۔

۱۱۔ اختر شیرانی

آپ حافظ محمود شیرانی کے صاحبزادے ہیں، جو پنجاب کے ایک معزز پروفیسر ہیں۔ اور علمی تحقیق و تفتیش کے لحاظ سے ایک بلند پایہ رکھتے ہیں۔ اختر شیران ریاست ٹونک میں پیدا ہوئے اور اس کے بعد وہ لاہور چلے گئے، جہاں اب تک مقیم ہیں۔

اختر نوجوان شاعروں میں بہت مقبول و ہر دلعزیز ہیں۔ ان کی رومانی نظموں میں ہر نوجوان اپنے جذبات و خیالات کی جھلک پاتا ہے۔

۱۲۔ احسان بن دانش

احسان الحق نام۔ احسان تخلص۔ وطن آبائی باغپت ضلع میرٹھ اور مولد و منشا کاندھلہ ضلع مظفر نگر ہے۔ آپ قاضی دانش علی صاحب کے فرزند ارجمند ہیں اور اسی نام کی مناسبت سے آپ خود کو احسان بن دانش لکھتے ہیں۔ آپ کی عمر اس وقت تقریباً ۳۰ سال کی ہے۔

آپ کے والد کے پاس معقول جائداد تھی۔ لیکن چونکہ وہ صاف دل اور پاک طینت بزرگ ہیں۔ اس لئے آپ کے دیگر اعزا نے اس سادہ لوحی سے ناجائز طور پر کسب منفعت شروع کر دیا حتیٰ کہ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کی کُل جائداد خود غرض عزیزان کے قبضے میں چلی گئی اور خود بیچارے تہی دست ہو گئے۔ اور آپ کو مجبوریوں نے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا۔ آپ نے باغپت کو خیرباد کہہ کر کاندھلہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہیں پر احسان الحق تولد ہوئے۔

احسان نے کاندھلہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور آپ نے پرائمری کی چند جماعتیں بہت جلد پاس کر لیں اور حافظ سید محمد مصطفےٰ صاحب سے عربی پڑھی۔ مگر والد صاحب کی طویل اور خطرناک علالت نے احسان کو مزدوری کا ادنیٰ پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ اسی اثنا میں احسان کو قاضی محمد زکی۔ زکی کاندھلوی کی صحبت سے شاعری کا شوق پیدا ہوا اور آپ ہی کے آگے زانوئے شاگردی بھی تہ کیا۔

گردشِ دوراں نے احسان کو بھی کاندھلہ چھوڑنے پر مجبور کیا۔ آپ مختلف شہروں کی کوچہ گردی کرتے رہے۔ آخرش لاہور میں داخل ہو کر احسان نے معماروں کے ہمراہ مزدوری کی اور معماری کے فن کو بھی بہت جلد سیکھ لیا۔ اس کے علاوہ آپ نے باغبانی بھی سیکھی۔

سنہ ۱۹۲۹-۳۰ء میں احسان نے اپنا کلام اکثر رسائل میں بھیجنا شروع کیا اور اسی زمانے میں اپنے ابتدائی کلام کا ایک مختصر سا مجموعہ پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا اور خود اس کو فروخت بھی کیا۔

احسان صاحب عہد حاضرہ کے ایک عدیم النظیر شاعر ہیں۔ آج کل لاہور میں مقیم ہیں اور ادب نواز اور اہلِ قلم کی ایک انجمن "تعمیر ادب" کے نام سے قائم کی ہے۔

آپ کی تصانیف میں رموز غالب، حدیث ادب، چراغ عجائبات، آتش خاموش، نورِ کارگر اور دردِ زندگی وغیرہ زیادہ مشہور ہیں جو ڈلیشان بک ڈپو مزنگ لاہور سے مل سکتی ہیں۔

۱۳۔ شاد عظیم آبادی

علی محمد نام، شاد تخلص، آپ کے والد سید عباس مرزا الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ پندرہ سال کی عمر میں وہ پٹنہ عظیم آباد چلے گئے۔ وہیں سنہ ۱۸۴۶ء میں شاد پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد عربی، فارسی میں خاصی استعداد پیدا کرلی۔ وزیر علی عبرتی اور مولانا میر تصدق حسین زخمی سے آپ نے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ سنہ ۱۸۹۱ء میں گورنمنٹ نے آپ کو "خان بہادر" کا خطاب عطا فرمایا اور آنریری مجسٹریٹ بھی مقرر کر دیا اور سرکار سے ایک ہزار روپیہ سالانہ آپ

کے لئے مقرر ہوا۔

آپ کا کلام نہایت شیریں اور سادہ ہے۔ مشکل سے مشکل مسائل آپ روزمرہ بول چال اور عام فہم الفاظ میں نظم کرتے ہیں۔ آپ کے کلام میں فلسفہ، تصوف اور اخلاق کا عنصر موجود ہے۔ مرثیوں میں میر انیس کا رنگ نظر آتا ہے۔

آخر کار ۱۳۴۵ھ مطابق ۱۹۲۹ء میں ۸۳ برس کی عمر میں آپ کا انتقال ہو گیا۔

۱۴۔ حامد اللہ افسر میرٹھی

حامد اللہ نام۔ افسر تخلص۔ میرٹھ کے مفتی خاندان سے ہیں۔ میرٹھ کالج سے بی۔ اے پاس کیا۔ آج کل گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج لکھنؤ میں اردو کے پروفیسر ہیں۔

افسر جدید طرز کے ممتاز شاعروں میں ہیں۔ قومی جذبات کی نمائندگی، مناظر قدرت کی مصوری، زبان کی سلاست آپ کے کلام کی خصوصیات ہیں۔

آپ کا منظوم کلام 'پیام روح' کے نام سے شایع ہو چکا ہے۔

۱۵۔ شبیر حسن جوش ملیح آبادی

شبیر حسن نام۔ جوش تخلص، ملیح آباد ضلع لکھنؤ کے رہنے والے ہیں۔ ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان عرصہ سے علمی و ادبی خدمات انجام دے رہا ہے۔ چنانچہ نقیر محمد خاں گویا جن کی بستانِ حکمت یادگار ہے اور ایک دیوان بھی موجود ہے، آپ کے پردادا تھے۔ آپ کے دادا محمد احمد خاں بھی صاحبِ دیوان ہوئے ہیں۔

ابتدائی تعلیم مکتب میں حاصل کرنے کے لئے۔ ابھی لڑکپن ہی میں والد کا انتقال ہو گیا۔ اس لئے یہ اعلیٰ تعلیم جاری نہ رکھ سکے لیکن فطری ذہانت اور خداداد قابلیت اور ذکاوت کی وجہ سے ممتاز شعراء میں ان کا شمار ہونے لگا۔ کیونکہ انھیں بچپن ہی سے شعر و شاعری کا شوق تھا اور مکتب میں بھی شعر و سخن جاری رہی۔

عرصہ تک دارالترجمہ حیدر آباد میں عربی نقاد کی حیثیت سے کام کرتے رہے لیکن آج کل وطن ہی میں ہیں اور ایک رسالہ جاری کیا ہے۔

کلام میں رنگینی، دلکشی، جدت اور تشبیہات میں ندرت ہے۔ ایک قسم کا جوش اور زور ضرور پایا جاتا ہے۔ غزلوں میں سوز و گداز ہے۔ بندش میں چستی ہے۔ ابتذال اور سوقیانہ پن سے کلام پاک ہے۔ عربی، فارسی کے مشکل الفاظ بھی آپ نے استعمال کئے ہیں۔ غزلوں

کے علاوہ نظمیں کثرت سے موجود ہیں جس میں اصلاحی اور اخلاقی رنگ جھلکتا ہے۔

۱۶۔ حفیظ جالندھری

ابوالاثر حفیظ جالندھری شہر جالندھر (پنجاب) کے رہنے والے ہیں۔ جہاں آپ سنہ ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ آپ چوہان سورج بنسی راجپوت خاندان سے ہیں۔ آپ کے آباؤ اجداد آج سے تقریباً دو سو سال پہلے مسلمان ہو گئے تھے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم جالندھر میں ہوئی۔ بچپن ہی سے اردو زبان اور شاعری سے آپ کو فطری مناسبت تھی۔ گیارہ سال کی عمر میں آپ نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ آپ کو فارسی کے باکمال شاعر مولانا قادر گرامی مرحوم سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں ریاست خیرپور (سندھ) کے فرمانروا نے آپ کو اپنا درباری شاعر مقرر کیا۔ لیکن آپ کو یہ زندگی پسند نہ آئی اور آپ جلد ہی اس سے علیحدہ ہو گئے بعد ازاں آپ نے اسلامی تاریخ کو نظم کرنا شروع کیا جو آپ کی شہرت کا باعث ہوا۔ اور سنہ ۱۹۳۴ء میں گورنمنٹ نے اس خدمت کے صلے میں آپ کو "خان صاحب" کا خطاب عطا کیا۔ مسلسل دماغی محنت اور بعض المناک حادثوں کی وجہ سے آپ کی صحت خراب ہو گئی ہے اور ڈاکٹروں کے مشورہ سے آپ انگلستان بھی تشریف لے گئے تھے۔

اس وقت آپ شاہنامۂ اسلام کی تدوین میں مصروف ہیں۔

حفیظ صاحب کی شاعرانہ سرگرمیوں کی زریں پیداوار شاہنامۂ اسلام ہے جس کی اب تک تین جلدیں شایع ہو چکی ہیں۔ اس میں آپ نے اسلامی تاریخ کے معتبر واقعات کو صحیح جذبات کے ساتھ قلمبند کر کے فارسی کے شہرۂ آفاق شاعر فردوسی کی طرح کمال شاعری نمایاں کیا ہے، تمام کلام روانی، زور، جوش، شان و شوکت، سادگی اور لطافت سے مملو ہے۔ نئی ترکیبیں اور اچھوتی تشبیہیں آپ کی خاص چیز ہیں، اس کے علاوہ آپ نے بہت سی دوسری نظمیں و گیت بھی لکھے ہیں جو اردو میں نئی چیز ہیں۔ یہ نظمیں اور گیت بیحد رنگین، پر کیف اور نغمہ آفریں ہیں۔

۱۷۔ روشن صدیقی

نام شاہد عزیز احمد ہے اور تخلص روشن، ضلع سہارن پور (یو۔پی) میں ایک قصبہ جوالا پور نامی ہے جو ہردوار کے نزدیک واقع ہے یہاں آپ کی ولادت ۱۹۱۱ء میں ہوئی۔ آپ نے اپنے والد بزرگوار مولانا فضل احمد شاہد کے زیر عاطفت تعلیم و تربیت حاصل کی اور ان سے اکتساب فیض کیا۔ اردو کے علاوہ آپ کو فارسی، ہندی، انگریزی اور سنسکرت زبانوں سے بھی ربط ہے۔ ذہنی تربیت میں مشرقی روایات و برکات کا بڑا دخل رہا ہے آپ نے چھ سات سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا، شاعری میں آپ

کو روحِ تغزّل سے ہمیشہ محبت رہی نظم نگاری میں بھی اس شگفتگی
کی جھلک نمایاں ہے۔

آپ نے ادبی اجتماعات میں شرکت اور دیگر ادبی مقاصد کے سلسلے میں تقریباً تمام ہندوستان کا سفر کیا ہے دریائے جناب، جھیلم گنگا اور برہمپتر کی وادیاں ہمالیہ، کشمیر، بندھیاچل اور دکھن کی پہاڑیاں سب آپ سے واقف ہیں۔ آپ مشرق کو نسل انسانی کے لئے گہوارۂ تمدن و تہذیب سمجھتے ہیں۔ اور مغرب کے ذوقِ علم اور سعیٔ عرفانِ خودی کے بھی معترف ہیں، انسانی مظلومیت کی داستانیں آپ کو بہت متاثر کرتی ہیں۔ آزادیٔ انسان کو سب سے بڑی جنت خیال کرتے ہیں محبت و اخلاص آپ کی سیرت کا نمایاں پہلو ہے۔ نفرت اور مغائرت کے لئے آپ کے دل میں کوئی جگہ نہیں ہے۔

آپ کی نظموں میں ہلکا ہلکا سا درد اور دھیما دھیما سا سوز رہتا ہے۔ جو قلب کو بہت متاثر کرتا ہے۔

۱۸۔ سید نجم الہدیٰ گیلانی

سید نجم الہدیٰ صاحب نجم گیلانی کا وطن ضلع پٹنہ کی ایک بستی گیلان ہے جہاں آپ ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے فارسی اور اردو کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ پھر پٹنہ کالجیٹ اسکول سے میٹرک

پاس کیا اور ۱۹۲۱ء میں پٹنہ کالج سے فارسی میں فرسٹ کلاس آنرز کے ساتھ بی۔ اے کی ڈگری لی۔ بعد ازاں پٹنہ کالج سے وکالت کا امتحان پاس کیا۔ تحصیل علم سے فارغ ہو کر چھے سال تک عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن میں تاریخ کے پروفیسر رہے لیکن آب و ہوا کی ناموافقت اور خرابی صحت کے باعث اس ملازمت سے علحدہ ہو گئے اور پٹنہ چلے آئے۔ یہاں کئی سال تک وکالت کی، اس دوران میں قومی سرگرمیوں اور صوبہ بہار کی سیاسیات میں نمایاں حصہ لیتے رہے اور اس سلسلے میں انھوں نے ایک انگریزی اخبار بنام "پروگرس" اور اُردو اخبار "پیغام" نامی نکالا جن کی اڈیٹری کے فرائض خود انجام دیتے رہے۔ ۱۹۳۵ء میں پٹنہ کالج میں اُردو کے لکچرر مقرر ہوئے۔ ہندوستانی زبان کی تدوین و توسیع کے لئے بہار کی کانگریسی حکومت نے جو ہندوستانی کمیٹی مقرر کی ہے، اس کے سکریٹری کے اہم فرائض نجم صاحب ہی انجام دے رہے ہیں۔

شاعری کا شوق ان کو بچپن ہی سے ہے لیکن غزل گوئی مرغوب نہیں۔ صرف نظم نگاری سے ذوق ہے۔ کالج کی تعلیم کے زمانے میں انھوں نے بعض نظموں پر علامہ ڈاکٹر اقبال مرحوم سے اصلاح لی ہے۔ نظمیں زیادہ تر قومی اور سیاسی رنگ کی ہیں جو جوش، ولولہ اور زور سے لبریز ہیں۔

١٩۔ اختر اورینوی

ان کا نام سید اختر احمد ہے اور اختر تخلص۔ موضع اورین ضلع مونگیر کے رہنے والے ہیں۔ ان کی پیدائش سنہ ۱۹۱۰ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد انھوں نے مونگیر ضلع اسکول پھر سائنس کالج اور پٹنہ کالج میں تعلیم پائی اور سنہ ۱۹۳۶ء میں ایم۔ اے پاس کیا۔ اس وقت آپ پٹنہ کالج میں اردو کے لکچرر ہیں۔

اختر صاحب بہار کے ایک کامیاب ادیب ہیں، ڈراما، افسانہ، تنقید، نظم، چاروں صنف میں آپ نے کافی مہارت حاصل کی ہے ان کے مضامین نظم و نثر اردو کے موقر رسالوں میں برابر شایع ہوتے رہتے ہیں، انھوں نے دورِ حاضرہ کی مغربی ادبیات خصوصاً انگریزی ادب کا غائر مطالعہ کیا ہے۔ لہذا ان کے تنقیدی مقالات جدید رجحانات کے حامل ہیں۔ ان کا کلام رنگین اور جوش آفریں ہوتا ہے۔ ان کا فلسفۂ عمل سر اقبال کے فلسفۂ عمل سے متاثر ہے۔ ان کا ڈراما "شہنشاہ حبشہ" ایک معقول تصنیف ہے۔

۲۰۔ ولی کاکوی

نام سید شاہ ولی الرحمن ہے اور ولی تخلص۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں قصبہ کاکو

ضلع گیا میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے گھر پر پائی۔ عربی و فارسی پڑھ لینے کے بعد حافظ قرآن ہوئے۔ پھر انگریزی شروع کی۔ شروع سے اپنی کلاسوں میں ممتاز رہے۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں پٹنہ کالج سے ایم۔ اے کا امتحان درجۂ اول میں پاس کیا اور سنہ ۱۹۲۷ء سے ڈپٹی مجسٹریٹی کے عہدہ پر فائض ہیں۔

وفیؔ صاحب کو شاعری کا شوق بچپن سے ہے۔ کتب بینی کا خاص شغف ہے۔ طبیعت ادب و تنقید کی طرف مائل ہے۔ شاعری میں ان کو حضرت شادؔ عظیم آبادی سے شرف تلمذ حاصل ہے اور ان کی نظمیں اور غزلیں پُر کیف و رنگین ہوتی ہیں، انگریزی نظموں کو اردو نظم میں بیساختہ ترجمہ کر لینے کا بھی خاص سلیقہ ہے۔ نثر لکھنے میں بھی کافی مہارت ہے۔

۱۳۱ شوکت علی خاں صاحب فانیؔ۔ بدایونی

آپ سنہ ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے آبا و اجداد کابل سے شاہ عالم کے زمانے میں ہندوستان آئے۔ فانیؔ نے تیرہ سال تک قدیم طریقہ پر عربی اور فارسی کی تعلیم پائی۔ اس کے بعد انگریزی شروع کی اور سنہ ۱۹۰۱ء میں بریلی کالج سے بی۔ اے پاس کیا اور سنہ ۱۹۰۸ء میں علی گڑھ سے وکالت کی ڈگری لی۔

فانیؔ کو شعر گوئی کا شوق بچپن سے تھا اور بیس برس کی عمر تک انھوں نے بہت سے کلام جمع کر لیئے، ان کے کلام کا سب سے پہلا مجموعہ "باقیات فانی"

کے نام سے شایع ہوا۔ دوسرے مجموعے کا نام "عرفانیات فانی" ہے۔

فانی نے ۲۶ راگست ۱۹۴۱ء کو انتقال کیا۔

فانی ایک سنجیدہ مزاج شاعر تھے ان کے کلام میں یاس و حسرت کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ ان میں میر کا سوز و گداز اور غالب کی مضمون آفرینی ہے۔ اس لحاظ سے وہ دور حاضر کے شعراء میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں کیونکہ انھوں نے اپنے لئے ایک نئی راہ نکالی تھی۔

۲۳۔ مولانا فضل الحسن حسرت موہانی

مولانا فضل الحسن نام حسرت تخلص۔ سید اظہر حسین صاحب کے صاحبزادے۔ موہان ضلع اناؤ کے رہنے والے ہیں۔ موہان ہی میں ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر حاصل کی پھر تعلیم کی تکمیل کے لئے علی گڑھ کالج گئے۔ وہاں سے ۱۹۰۳ء میں بی۔ اے پاس کیا۔

طالب علمی ہی کے زمانے سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ کالج سے فراغت حاصل کرنے کے بعد علمی و ادبی خدمات کی طرف متوجہ ہو گئے۔ امیر اللہ تسلیم کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ ایک عرصہ تک "اردوئے معلّیٰ" نامی رسالہ جاری کر کے ادب اردو کی خدمت کرتے رہے۔ فن تنقید میں خوب مہارت حاصل کی۔ ان کا شمار اردو کے بہترین پُرگو شعراء میں ہے۔ ان کے اب تک کئی دیوان شایع ہو چکے ہیں اور دیوان غالب کی شرح بھی آپ نے اعلیٰ درجہ کی کی ہے

اور ایک تذکرۃ الشعرا بھی مرتّب کیا ہے۔
کلام میں درد و اثر، خیالات میں پاکیزگی، زبان میں صفائی موجود ہے روانی و شگفتگی نمایاں ہے۔ عام طور سے عام فہم الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

۲۴۔ جگت موہن لال رواںؔ

جگت موہن لال نام تھا اور رواںؔ تخلص کرتے تھے۔ چودھری گنگا پرشاد کے صاحبزادے تھے۔ ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ ۹ سال کی عمر میں والد کا انتقال ہو گیا۔ بڑے بھائی منشی کنھیّا لال نے ان کی تعلیم و تربیت کی۔ یہ نہایت ہی ذہین اور طبّاع تھے۔ ۱۹۱۳ء میں ایم۔ اے اور ۱۹۱۶ء میں قانون کا امتحان پاس کیا۔ اُنّاؤ میں وکالت شروع کی اور بہت جلد وہاں کے ممتاز وکیلوں میں ہو گئے۔

اپنا کلام مرزا محمد ہادی عزیزؔ لکھنوی کو دکھاتے تھے چنانچہ غزلوں میں ان کا اثر نمایاں ہے۔ کلام میں متانت اور سنجیدگی کافی ہے۔ فارسی ترکیبوں کے ساتھ مختصر الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ غزلوں میں برجستگی، دلکشی اور تاثیر موجود ہے۔ رباعیاں کثرت سے کہی ہیں۔

اکتوبر ۱۹۳۴ء میں ۴۵ برس کی عمر میں آپ کا انتقال ہوا۔

نیشنل پریس الہ آباد میں باہتمام رمضان علی شاہ چھپی

Date	No.	Date	No.